

# تاریخ عاشورا

(تحریک کربلا کے پس منظر و پیش منظر کا محققانہ جائزہ)

ڈاکٹر ابراہیم آیتی

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

سپیل سکیڑ

پیرا اولیٰف آباد، پونٹ نمبر ۱۶۱

# نایم عاشر

(تحریکِ کربلا کے پس منظر و پیش منظر کا محققانہ جائزہ)

BOOK FAIR  
IBNE ZEHRA  
INSTITUTE

ڈاکٹر ابراہیم آتی

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

ترجمہ ----- مُستجاب احمد انصاری  
 نظر ثانی ----- رضا حسین رضوانی  
 کتابت ----- اشرف راحت  
 صحیح ----- کاظم علی گجراتی  
 مطبع ----- زمزم پبلیشرز کراچی  
 طبع ----- ششم - ۲۰۰۴ء

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔ یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ  
 جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کئے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل،  
 تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتہ کرانے پر دی جائے گی اور نہ ہی وہ بارہ فروخت کی جائے  
 گی۔ علاوہ ان کے کسی آئینہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لئے بھی  
 ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

## کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئیؒ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اور مستند اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرنا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سواحلی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اس کے علاوہ جامعہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوت اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہئے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمد و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نقوی

دیکھیں حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی



## قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اس ادارے کی مطبوعات کی تیاری کا مقصد دو رجحانوں کی روحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرز فکر کو اجاگر کرنا ہے۔ اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطہ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر نہ فرمائیں جو بڑی خوشی سے اور شکر کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

”(اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمہیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو“  
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار: سیکریٹری نشر و اشاعت

# انتساب

ان جبری اور سرفروش مردانِ خدا کے نام  
جنہوں نے ساحلِ فرات پر  
اپنے چراغِ زندگی کو ٹھکل کر کے  
قندیلِ اسلام کو فروزاں رکھا  
تاکہ اس کی تابانی سے بزمِ کائنات منور رہے۔  
شمعِ شہادت کے ان پروانوں نے  
احیائے اسلام اور ولایتِ اہلبیتؑ کی خاطر  
اپنے خون میں ڈوب کر  
تاریخِ اسلام کا وہ رنگین باب رقم کیا  
جس کا غلغلہ چار دانگِ عالم میں یوں بلند ہوا  
کہ ملوکیت کے چہرے کو داغِ داغ کر گیا۔


 ہو سالار شہیدال حسین ابن علیؑ پر، ان کے فرزند  
 ولبند پر، ان کے جاں نثار بھائیوں پر اور ان کے  
 طفل شیر خوار پر۔ سلام بے پایاں ہو ان پاک ارواح پر جنہوں نے  
 کمال دلیری اور خلوص کے بے پناہ جذبے کے ساتھ اپنی ہر کابلی  
 میں اپنی جانیں دین اسلام پر قربان کر دیں، قرآن اور اہلبیتؑ  
 کی حرمت کی خاطر اپنے سر کٹوا دیے، اپنے خون سے شجر اسلام کی  
 آبیاری کی اور زمین کو ہلا کر اپنے اہو سے لالہ زار بنا دیا جنہوں  
 نے خذہ پیشانی سے موت کا استقبال کیا، اپنے جسم کے ٹکڑوں  
 سے دامن خاک کو عظمت بخشی، اپنی روحانی کشف سے لوگوں  
 کے دل جیت لیے اور اپنے مزاروں کو قبلہ گاہ اہل معرفت بنا دیا۔

# فہرست

۱۱	مقدمہ
۵۹	امیر شام کائفوز
۶۳	یزید کی خلافت
۶۹	امامؑ کے نام اہل کوفہ کے خطوط
۷۰	مسلمؑ بن عقیل کی کوفہ روانگی
۷۷	مسلمؑ بن عقیل کی شہادت
۸۳	محمد بن حنفیہ
۸۵	محمد بن حنفیہ کے لیے امامؑ کا وصیت نامہ
۸۸	امامؑ کے قیام کی وجوہات
۹۰	صلح امام حسنؑ



- ۹۳ معاویہ کے نام امام حسینؑ کا خط
- ۹۴ یزید کا تعارف
- ۱۰۱ امامؑ کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر تھا
- ۱۰۶ حضرت سید الشہداءؑ کے مناقب
- ۱۱۰ قرظوق کی امامؑ سے گفتگو
- ۱۱۹ امامؑ کا بیعت نام کا خطبہ
- ۱۲۸ امام حسینؑ کا کربلا میں ورود
- ۱۳۱ ام البنین کے بیٹوں کے لیے امان نامہ
- ۱۳۴ شب عاشورا میں امامؑ کا خطبہ
- ۱۳۶ امامؑ نے جب اشعار کہے
- ۱۴۰ صبح عاشورا
- ۱۴۱ صبح عاشورا امامؑ کی دعا
- ۱۴۲ لشکر یزید سے امامؑ کا خطاب
- ۱۴۸ تحریک کربلا اور منہی انداز فکر
- ۱۵۵ سانچہ کربلا کیوں بھلا یا نہ جاسکا؟
- ۱۶۲ کوفہ میں امام سجادؑ کا خطبہ
- ۱۶۶ دمشق کی مسجد میں امام سجادؑ کا خطبہ
- ۱۶۸ اہل بیتؑ کا سفر کوفہ و شام
- ۱۸۱ تحریک کربلا تحریف سے محفوظ رہی ہے

۱۸۳

یوسفیان کا عظمت پیغمبرؐ کا اعتراف

۱۸۷

کلمات امیر المؤمنینؑ

۱۹۰

منصور و وائقی کا وصیت نامہ

۱۹۳

تخریب کربلا کیوں ناقابلِ فراموش ہے؟

۱۹۶

تخریب کربلا کی گرامی قدر خواتین

۲۰۲

حضرت زینبؑ کا ابن زیاد کو جواب

۲۰۵

تاریخ بہت طاقتور ہے

۲۰۹

دو بار نیرید میں حضرت زینبؑ کا خطبہ

۲۱۲

تاریخ کا کیا فائدہ ہے؟

۲۱۵

سنت الہی ناقابلِ تغیر ہے

۲۲۰

قانون الہی پر امام علیؑ کا خطبہ

۲۲۵

دعوتِ ذوالعشیرہ

۲۲۸

اصحابِ حسینؑ منزلِ یقین پر

۲۳۰

آلِ ابی طالبؑ جو کربلا میں شہید ہوئے

۲۳۲

اسلامی تربیت کا اثر

۲۳۷

انصارِ مدینہ کی بیعت

۲۴۲

مدینہ کے تاریخی ایام

۲۴۳

قتلِ حسینؑ پر اظہارِ مسرت

۲۴۷

اہل بیتؑ کی مدینہ واپسی

۲۵۰

نعمان بن بشیر

۲۵۲

قریش کا رسول خدا سے سلوک

۲۵۴

اوس اور خزرج

۲۵۸

تاریخ عاشورا کی سند

۲۶۸

مسجد شام میں دیے گئے خطبے کی تفصیل

۲۷۲

مدینہ واپسی پر امامؑ کا خطبہ

۲۷۵

جایزہ اور عطیہ کی کہ بلا آمد

۲۷۸

مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں

۲۸۵

روزِ اربعین

۲۸۵

ہر مسلمان اسلام شناس نہیں ہوتا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مقدمہ

تاریخ السانی کا ایک فقید المثل واقعہ ہے۔ محرم الحرام  
۱۳۵۰ھ کی دسویں تاریخ کو ابو عبد اللہ امام حسینؑ

کربلا

نے جو عظیم الشان قربانی پیش کی اور جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا وہ ہر اس  
شخص کے لیے مشعلِ راہ ہے جو اپنی تحریک پر کامل یقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا  
خواہاں ہو۔ آپ نے تمام عواقب کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے اعزہ و اقربا، حبابِ رضاء  
اور خود اپنی جان و مال غرضیکہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور اپنے عزم و استقلال کی بدولت  
تمام بنی نوع انسان کو رہتی دنیا تک درطہ حیرت میں ڈال دیا جب انسان اس حیرتغولی  
جنگ کے حالات پڑھتا ہے تو اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے  
ہیں جن میں سے ایک غور طلب اور اہم سوال یہ ہے کہ امام حسینؑ نے جو فیئر معمولی قدم کیا  
اسکا اصل منشا کیا تھا۔ آیا وہ یزید کی بیعت سے گریزاں تھے؟ کیا انھوں نے کوفیوں

کی درخواست پر یہ قدم اٹھایا تھا یا ان کے قیام کا مقصد آجکل کی اصطلاح میں انقلاب لانا تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا یا نہیں کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے؟ آیا ان کے ذہن میں پہلے سے طے شدہ کوئی پروگرام تھا جس کے مطابق وہ عمل کر رہے تھے۔ یا وہ ہر صورتِ حال کے متعلق وقت کے وقت فیصلہ کرتے تھے؟ راستے میں مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملتے پر انہوں نے اپنے ہمراہیوں سے کیوں کہا کہ تم چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو اور پھر بعد میں امداد کیوں طلب کی؟ شب عاشورا میں سب کو چلے جانے کو کیوں کہا؟ حبیب ابن مظاہر کو قبیلہ بنی اسد سے مدد طلب کرنے کیوں بھیجا؟ عبید اللہ بن حُر جعفی سے قصص بنی مقاتل میں کیوں مدد مانگی؟ شب عاشورا میں فرزند ان عقیل سے یہ کیوں کہا کہ تم چلے جاؤ یہی کافی ہے کہ مسلم مارے گئے؟ ضحاک بن عبد اللہ مشرقی اسکے دوست زبیر بن عقیل سے مدد کیلئے امر کیوں کیا اور یہ کیوں کہا کہ تم آخر دم تک میرے ساتھ رہو؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ امام عالی مقامؑ انجرام سے بے خبر تھے؟ کیا انھوں نے پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی نقشہ ترتیب نہیں دیا تھا؟ کیا ان کا اقدام اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا نہیں تھا؟ جس آدمی کو معلوم ہو کہ وہ سرکٹوانے جا رہا ہے کیا وہ اپنے زن و فرزند اور شبیر خوار بچوں کو بھی اپنے ساتھ مرنے کے لیے لے جاتا ہے؟

ان سوالوں کے جواب میں بہت سی بے بنیاد، غلط اور واہی تباہی باتیں کہی گئی ہیں۔ کچھ نے کہا ہے کہ چونکہ امام حسینؑ یرید کی بیعت کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ خوف کی وجہ سے یہ سمجھ کر مدینہ سے نکالے گئے کہ مکہ جاتے امن ہے۔ آپ وہیں قیام کرنا چاہتے تھے لیکن اتفاق ایسا

ہوا کہ اہل کوفہ نے انھیں بلاوے پر بلاوا بھیجا اور بھر پور اندو کا یقین دلایا۔ آپ کو خود بھی اندیشہ تھا کہ ہمیں کوئی کعبہ کی حرمت کو نظر انداز کر کے حملہ ہی نہ کر بیٹھے لہذا آپ نے اہل کوفہ کی دعوت قبول کر لی اور کربلا کی طرف روانہ ہو گئے مگر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ آپ خود بھی قتل ہوئے، آپ کے فرزند بھی مارے گئے اور اہل بیتؑ ابھی اسیر ہوئے۔

کچھ دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ انجام ہوگا ورنہ وہ ہرگز ایسا اقدام نہ کرتے۔

بعض کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ سے اپنی نسبی قرابت کی بنا پر امام حسینؑ کو اعتماد تھا کہ کوئی انھیں گزند پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اسی وثوق کی بنا پر انھوں نے یہ خطرناک اقدام کیا یا پھر ان کو قومی اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے کوئی اقدام نہ بھی کیا تو ابن زیاد یا کوئی دوسرا انہیں ضرور قتل کر دے گا لہذا انہوں نے ذلت کی موت پر جہاد کو ترجیح دی۔

کچھ کہتے ہیں کہ یہ اقدام اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا تو تھا لیکن چونکہ حکم خداوندی تھا اس لیے تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کچھ مخالفین جو ہر کس و ناکس کو اپنا اولی الامر سمجھتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے حکومت کی خواہش اور ریاست کے لالچ میں یہ خطرہ مول لیا۔ ہاں حاکمان وقت کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ انہیں اس بے دردی سے قتل کرتے بلکہ اگر ترغیب اور ترہیب سے کام لیتے تو بہتر تھا۔

دراصل ان تمام سوالات کا صحیح جواب یہ ہے کہ معاویہ کے دور حکومت کی ابتداء ہی سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ اس تحریک کی ضرورت محسوس

ہونے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی شدت میں برابر اضافہ ہونا رہا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر امام حسینؑ یہ قدم نہ اٹھاتے تو ڈر تھا کہ خود دین اسلام خطرے میں پڑ جاتا۔

ان اسباب میں سب سے بڑھ کر تو خلیفہ کے انتخاب کا وہ انوکھا طریقہ تھا جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ معاویہ نے اس صلح نامے کی شرائط کو نظر انداز کر کے جو امام حسنؑ کے ساتھ طے پایا تھا یزید کے لیے بیعت لی۔ پھر عمال و حکام کے نام فرمان جاری ہوا کہ جس کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ دوستدار علیؑ اور محب اہل بیتؑ ہے اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے اور فوجی اور شہری وظیفہ یابوں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا جائے۔ یہ دو سرافران یہ جاری ہوا کہ جس پر ہوادار علیؑ ہونے کا شبہ ہوا سے نرا دی جائے اور اس کا گھر تباہ کر دیا جائے۔ یہ حکم اتنا سخت تھا کہ بقول ابن ابی الحدید معتزلیؒ شیعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور اس پر بھی خود اپنے غلاموں اور کیزوں سے خوفزدہ رہتے تھے کہ مبادا کوئی چغلی نہ کھائے۔ جو کوئی کسی سے ناراض ہوتا شکایت کر دیتا کہ فلاں شخص دوستدار علیؑ ہے اور پھر اسکی ضمانت آجاتی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ سختی عراق میں ہوئی جہاں کا والی زیاد بن سمیئہ تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہر جگہ جمعہ کے خطبوں اور دیگر موقول پر امام علیؑ پر ان کی درخشندہ اسلامی خدمات کے باوجود سب و ستم کیا جاتا اور معاویہ اور یزید کی تعریف و توصیف کی جاتی۔ عراق کے والی زیاد بن سمیئہ کو یہ بھی حکم ملا کہ

لے شرح انج البلاغہ، ابن ابی الحدید (جلد ۳ - صفحہ ۱۵)

جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ مشیعہ ہے اس کی شہادت قبول نہ کی جائے اور اگر وہ کسی شخص کو پناہ دے تو اس کی دی ہوئی پناہ کا اعتبار نہ کیا جائے۔

حجر بن عدی، رشید ہجری اور ان کے دوسرے گیارہ ساتھیوں پر کب کیا بلائیں نازل نہیں ہوئیں۔ ان میں سے چھ بہترین افراد قتل ہوئے۔ کئی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ کئی کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ اگر کوئی زور سے سانس بھی لینا تو اسے قتل عثمان میں لوٹ قرار دے دیا جاتا۔ سادہ لوحوں کی تو ہر زمانے ہی میں کثرت رہی ہے۔ لوگ یقین کر لیتے کہ خونِ ناحق میں شریک واقعی اسی سزا کے مستحق ہیں۔

ایک طرف تو بنی امیہ کے حافی زہر پاشی کر رہے تھے اور دوسری طرف خارجی جو علیؑ اور معاویہ دونوں سے دشمنی رکھتے تھے معاویہ کے بارے میں تو مارے ڈر کے خاموشی اختیار کر لیتے، ہاں امیر المومنینؑ کے خلاف دیدہ دلیری سے زہر اگلتے۔ اس کے نتیجہ میں امام علیؑ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف بغض اور نفرت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ جب حضرت سید الشہداءؑ نے یوم عاشورا کو اپنے کو فہ کی طرف آنے کا مقصد بیان کرنے اور اتمامِ حجت کے بعد مخالفین سے پوچھا کہ تم آخر میرے قتل کے درپے کیوں ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں آپ کے والد سے بغض ہے۔

مصیبت یہی نہیں تھی کہ عوام کی اکثریت نو مسلم ہونے کے سبب بہ آسانی مخالفانہ پروپیگنڈے کا شکار ہو گئی تھی بلکہ نادانانہ کیفیت کی وجہ سے اکثر لوگوں کو صورتِ حال کا صحیح اندازہ تک نہیں تھا۔ وہ صرف یہی جانتے تھے کہ معاویہ



ایک بزرگ صحابی اور کاتب وحی ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں نے نہ صرف جنگِ صفین کے موقع پر ان کے خلاف معرکہ آرائی سے گریز کیا بلکہ امام حسن مجتبیٰؑ کو بھی صلح پر مجبور کیا۔

نصر بن مزاحم نے "کتاب صفین" میں اپنی سند سے اسماء بن حکم فسزاری سے روایت کی ہے کہ ہم صفین میں حضرت عمار بن یاسرؓ کے لشکر میں شامل تھے۔ ایک دن نھر کا وقت تھا، ہم نے سرخ چادر نيزوں پر تانی ہوئی تھی اور اس کے سایہ میں آفتاب کی تپش سے پناہ لے رکھی تھی کہ ناگاہ ایک شخص لشکر کی صفوں کو چھرتا ہوا ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ تم میں عمار بن یاسرؓ کون ہے؟ حضرت عمارؓ نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ اے ابو یقظان! حضرت عمارؓ کی کنیت مجھے ایک بات کہنی ہے، سب کے سامنے کہوں یا تنہائی میں؟

حضرت عمارؓ نے کہا: "سب کے سامنے کہو تو بہتر ہے۔"

اس شخص نے کہا کہ: "جب میں اپنے گھر سے چلا تو مجھے یقین تھا کہ معاویہ اور ان کے ساتھی گمراہی کے راستے پر ہیں مگر یہاں آیا تو دیکھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اذان دیتے ہیں۔ ان کا مؤذن بھی اَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ اَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ کہتا ہے۔ وہ بھی ہماری ہی طرح نماز پڑھتے ہیں اور ہماری ہی طرح دعا مانگتے ہیں۔ ان کی کتاب بھی قرآن ہے۔ ان کے اور ہمارے رسولؐ ایک ہی ہیں۔ جب میں نے یہ صورت دیکھی تو مجھے تعجب ہوا اور بے چینی ہونے لگی۔ صبح کو میں امیر المؤمنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ حال بیان کی تو آپ نے فرمایا: کیا تم عمار بن یاسرؓ سے ملے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے کہا کہ ان سے ضرور ملاقات کرو اور جو وہ کہیں مان لو۔ آپ

میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں؟“  
 عثمان بن یاسرؓ نے کہا کہ: ”وہ سامنے صاحب سیاہ پرچم دیکھ رہے ہو؟ یہ  
 عمرو بن العاص ہے۔ میں نے تین مرتبہ بدر، احد اور حنین میں رسول خدا کی محبت  
 میں اسی پرچم کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے۔ اب یہ چوتھی بار جنگ میں شرکت  
 کر رہا ہوں اور اس دفعہ حالت کچھ پہلے سے بدتر ہی ہے۔“

اسی کتاب میں نصر بن مزاحم ہی کی روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے کچھ  
 ساتھی جن میں عبیدہ سلمانی وغیرہ شامل تھے امیر المؤمنینؑ کی خدمت میں اس  
 وقت حاضر ہوئے جب آپ صفین تشریف لے جا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم  
 آپ کے ساتھ صفین چلنے کے لیے تو تیار ہیں لیکن آپ کے لشکر میں اس وقت  
 تک شامل نہیں ہوں گے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جائے کہ کون سا گروہ حق  
 پر ہے۔ ایسے ہی کچھ اور لوگ بھی امیر المؤمنینؑ کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے  
 اور کہتے تھے کہ ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت تذبذب میں مبتلا  
 تھی اور معاویہ بن ابی سفیان کو بزرگ صحابی سمجھ کر ان کے خلاف جنگ سے کتراتے  
 تھے۔ اب تو واقعہ صفین کو بھی بیس سال گزر چکے تھے۔ معاویہ نے پروپیگنڈا  
 زوروں پر تھا۔ امام علی بن ابی طالبؑ پر جو شیعہ سنی ہر دو فریق کی روایات کے مطابق  
 سب سے پہلے ایمان لائے تھے سب و شتم کا بازار گرم تھا۔ کچھ لوگ تو شاید

۱۔ کتاب صفین طبع دوم مصر صفحہ ۳۲۰ و طبع ایران صفحہ ۱۶۶

۲۔ کتاب صفین طبع مصر صفحہ ۱۱۵ و طبع ایران صفحہ ۶۲

حضرت علیؑ کو گالیاں دینا ایسا فرض سمجھتے تھے کہ نمازی کی نماز چھوٹ جائے لیکن ان کی گالیاں قضا نہ ہوں۔ رسولؐ خدا اپنی حیات طیبہ میں فرمایا کرتے تھے:

”جب بدعت پھیل جائے اور اس امت میں بعد میں آنے والے پہلے آنے والوں پر لعنت بھیجنے لگیں تو جس کے پاس علم ہو اس سنت اور بدعت میں فرق کر سکتا ہو) اسے اپنے علم کو ضرور پھیلا نا چاہیے۔ علم کو چھپانے والا ایسا ہی ہے جیسا اس چیز کو چھپانے والا جو اللہ نے محمدؐ پر نازل کی ہے۔“ لہ

امام حسینؑ اس سلسلے میں درگزر کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دین کی حفاظت کے لیے اللہ کی طرف سے مامور سمجھتے تھے اور اسی لیے اپنے وہ سالہ دورِ امامت میں کبھی بالکل خاموش نہیں بیٹھے۔ معاویہ اور ان کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی اور جہاں تک ممکن تھا وہ اپنی مراسلت کے مضمون سے حج کے موقع پر مکہ اور مدینہ میں لوگوں کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ ہر کاری مال میں سے شام لے جایا جا رہا تھا، امام حسینؑ نے اسے راستے میں ضبط کر کے فقیرانہ بنی باشم میں تقسیم کر دیا تھا اور ایک عتاب امیرِ خط میں معاویہ کو اس واقعہ کی اطلاع بھی دیدی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے آپ کا ارادہ انقلاب لانے کا تھا ورنہ یہ بات امام کے ستایانِ شان نہ ہوتی۔ وہ برابر اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے سعی کرتے رہتے تھے اور اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے کہ حتی الامکان انقلاب کے لیے راہ ہموار کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مراسلت، خطبوں اور تبلیغ کے مختلف ذرائع

لہ جامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۳۱ از معاذ بن جبل۔

لہ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۴ صفحہ ۳۲۷۔

کو بروئے کار لاتے رہتے تھے۔

یہاں تک کہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے جو فرض انہیں سونپا گیا تھا اسے پورا کرنے اور ام بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقصد سے راست اقدام کرنے کا وقت آگیا۔

ہم نے کہا ہے کہ امام حسینؑ اس اقدام کے لیے اللہ کی طرف سے مامور تھے اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو یعقوب کلینی نے الکافی میں بر سنہ معتبر ضریس کناسی کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ضریس کہتے ہیں کہ حمران بن اعین شیبانی نے امام باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری جان آپ پر قربان، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امیر المومنین اور حسین علیہم السلام کی زندگی میں کیا کیا واقعات پیش آئے انھوں نے جہاد کیا لیکن ناکامی ہوئی اور آخر ظالموں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے یونہی مقدر تھا انہوں نے جو کچھ کیا اللہ کے حکم سے کیا۔ امام علی اور حسین علیہم السلام نے اس سابقہ علم کی بنا پر جو انہیں رسول خدا کی طرف سے ملا تھا اور رسول خدا کے ارشاد گرامی کے مطابق جہاد کیا اور جن ائمہ نے سکوت اختیار کیا وہ بھی سابقہ علم اور امر ربی کے مطابق کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے پہلے سے ہر امام کے فرائض حکم الہی کی بنا پر متعین فرما دیے تھے اور ہر امام نے اپنے زمانے میں اسی کے مطابق عمل کیا۔

ہو سکتا ہے کسی کو اس قسم کی احادیث کی صحت کے بارے میں تردد ہو یا انہیں اخبار احمد تصور کرے یا ان کے مطلب کے بارے میں کوئی حدیث نہ ہو پھر بھی یہ بات تو عقلاً ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا رہبر و پیشوا وہی ہو سکتا ہے جو خود مومن اور

احکام شریعت کا پابند ہوا اور ظاہر ہے کہ اگر اسلامی حکومت اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ آجائے اور وہ طاقتور ہو جائیں تو وہ اسلام کی جڑیں کاٹ کر دکھ دیں گے اور یزید۔ جس کے باپ معاویہ نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس کے لیے سب سے بیعت لی۔ وہی شخص ہے جس نے اسلامی احکام کو بالعموم اپنے پاؤں تلے روندنا۔ اس نے منصب خلافت تک پہنچنے سے پہلے جو حزب اخلاق اور کفر آمیز اشعار کہے ان کا ذکر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کی کتابوں میں موجود ہے۔

یعقوبی اور بعض دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ جس سال معاویہ نے یزید کو بلا ورم کی فتح کے لیے بھیجا تھا اسلامی لشکر غزوة نامی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا وہاں عیسائیوں کی ایک خانقاہ تھی جس کا نام ڈیرمران تھا۔ یزید اس خانقاہ میں ام کلثوم نامی ایک عورت کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا۔ اسی دوران میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور مسلمان شکر ی خزاں دیدہ پتوں کی طرح گرنے اور مرنے لگے۔ ہر چند لوگوں نے اصرار کیا کہ یہاں سے جلد از جلد کوچ کرنا چاہیے لیکن یزید نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرا بلکہ کچھ شعر کہے جن کا مطلب یہ تھا کہ جب تک ام کلثوم میری آغوش میں ہے مجھے کسی کی پروا نہیں کچھ بھی ہوا کرے مجھے کیا غم۔

یزید سے شراب کی تعریف میں بھی یہودہ اشعار منقول ہیں۔ یزید کو عیاشی اور خوش گزرائی کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت عیسائیوں کی خانقاہوں میں گزارتا تھا جو اس زمانے میں پانچویں کالم کا درجہ رکھتی تھیں۔ لہو و لعب میں اسے اس درجہ مشغولی تھی کہ خود معاویہ نے اسے سرزنش کی تھی یقیناً شہداء نے صبح الاعشی جلد ۲ صفحہ ۸۷ میں نقل کیا ہے کہ جب بار بار یہ اطلاع ملی کہ یزید عیش و عشرت میں

پڑا ہوا ہے تو معاویہ نے اسے لکھا:

”میرے کانوں تک جو تیرے متعلق خبروں کے مشتاق رہتے ہیں واضح طور پر ایسی خبریں پہنچی ہیں جو بالوس کن ہیں اور جن سے صدمہ ہوا سنا ہے تو نے معیوب روش اختیار کر لی ہے اور فضائل و مکارم کے حصول کی جگہ غلط کاریوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کاش توجیب ہوا تھا تب ہی نہ ہوتا۔ لڑکپن میں تجھے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی اور تجھ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر انھوں نے جو ان ہو کر تو نے رلا دیا“ اس مکتوب سے یزید کی سیرت پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔

معاویہ نے ایک ایسے فرد کو جس کے وجود میں تمام خرابیاں جمع ہو گئی تھیں اور جو (جیسا کہ بعد میں بالکل واضح ہو گیا) فسق و فجور اور برائی کا جرم ٹومہ تھا اور جسے اسلام اور خدا کے احکام کا قطعاً کوئی علم نہ تھا مسلمانوں کے لیے رسول اکرمؐ کی جانثین کی حیثیت سے پیش کیا اور ان لوگوں پر مسلط کر دیا جن کی تلواروں سے مرعوب ہو کر اسی یزید کے اب و جد نے اسلام قبول کیا تھا حالانکہ رسول خدا کی رحلت کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ابھی صحابہ بقیہ حیات تھے بلکہ آنحضرتؐ کی کچھ ازواج بھی زندہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں ہو جو خدا اور رسولؐ پر اعتقاد نہ رکھتا ہوتا نہ پڑھتا ہو بے محابا شراب پیتا ہو اور شعا ز دینی کی توہین کرتا ہو تو اسلام اور قرآن کی فائز پڑھ لینی چاہیے۔ اس صورت میں کیا ممکن ہے کہ حسین بن علیؑ جیسا با خدا شخص اس بات پر تیار ہو جائے کہ اس کی نظروں کے سامنے ان جرائم کا ارتکاب کیا جائے اور وہ اپنے نانا کے دین کو ہر کس و نا کس کے ہاتھوں میں کھلوانا بنے ہوئے دیکھے اور اپنی حساموشی سے ان سب چیزوں کی تائید کرے یا بیعت اور لعن ان کی خاطر ہاتھ اگے بڑھائے؟

ہرگز نہیں!

ان حالات میں تنہا امام حسینؑ ہی نہیں تھے جو زید کی بیعت پر آمادہ نہیں تھے بلکہ کوئی بھی مسلمان جو قرآن کا علم اور خدا پر یقین رکھتا ہو اس سے بیعت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی چنانچہ کوفہ اور بصرہ کے متعدد لوگ اور تمام اہل تہذیب شروع ہی سے زید کے مخالف تھے۔

امام حسینؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ ابوسفیان کی اولاد بنیادی طور پر اسلام اور محمد بن عبداللہ کے ذکر کے باقی رہنے کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے شیعہ اسلام کو بھگانے کے لیے جتنی کوشش کر سکتے تھے کی ہے اور اس بات پر قطعاً رضا مند نہیں ہیں کہ رسول اکرمؐ کا نام باقی رہے اور اگر خلافت ابوسفیان کی اولاد کے پاس رہ گئی تو اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

مندرجہ ذیل قصے پر توجہ فرمائیں:

مسعودی نے مروج الذهب (مطبوعہ بولاق - مصر) کی دوسری جلد کے صفحہ ۶۶ پر مامون کے حالات کے سلسلے میں ذکر کیا ہے اور ابن ابی الحدید نے بھی اس کی جانب اشارہ کیا ہے کہ مطرف بن میسرہ نے کہا:

میں اور میرا باپ شام میں معاویہ کے ہمان تھے۔ میرا باپ اکثر معاویہ کے دربار میں جاتا تھا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ ایک رات جب وہ معاویہ سے مل کر لوٹا تو بے حد پریشان اور غمگین تھا۔ جب میں نے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب میں کہا: یہ شخص یعنی معاویہ بہت برا آدمی ہے بلکہ دنیا میں بدترین انسان ہے۔ میں نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا: میں نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب جب کہ تم اپنی ہمدرد کو بھج گئے ہو اور اسلامی خلافت تمہیں حاصل ہو گئی

ہے بہتر ہو گا کہ تم اس آخری عمر میں لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آؤ اور بنی ہاشم کے ساتھ اس قدر بد سلوکی نہ کرو کیونکہ آخر وہ تمہارے رشتہ دار ہیں اور اب ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کی بنا پر تمہیں خوف ہو کہ وہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ معاویہ نے کہا ہیہات! ہیہات! ابو بکر نے خلافت کی اور عدل سے کام لیا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا کہ وہ مر گیا اور اس کا نام بھی مٹ گیا۔ اسی طرح عمر اور عثمان بھی مر گئے اور گوانہوں نے لوگوں سے اچھا سلوک کیا مگر افسوس کہ ان دونوں کا نام بھی دنیا میں باقی نہ رہا لیکن برادر ہاشم (یعنی رسول اکرمؐ) کا نام لے کر ہر روز دنیا سے اسلام میں پانچ مرتبہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ جب تینوں علیقوں کا نام مٹ گیا اور محمدؐ کا نام زندہ ہے تو اس کے بعد کونسا کام کرنے کو رہ جائے ہے سولے اس کے کہ محمدؐ کا نام بھی مٹ جائے۔

یہ قصہ مسعودی نے زبیر بن بکار کی کتاب موفقیات سے لیا ہے جو ایک قابل اعتماد بنیادی تصنیف ہے۔ ان حالات میں کیا حسین بن علیؑ کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیں کہ اسلام اور قرآن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے اور انہیں نیست و نابود کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور اس کے باوجود خاموش رہیں؟ ہرگز نہیں!

ان دنوں خلافت اسلامی نے قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا رنگ اختیار کر لیا تھا معاویہ اسے اپنے خاندان میں موروثی بنانا چاہتے تھے لیکن اس سلسلے میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو یزید کی نالائقی جو ایک بدنام شخص تھا اور اس زمانے کی سربراہ اور دہ شخصیتیں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھیں۔ دوسرے



امام حسن مجتبیٰ کا وجودِ باجود جن سے شرائطِ صلح میں یہ طے پایا تھا کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہیں کریں گے۔ پہلی رکاوٹ کا ٹوڑ تو یہ سوچا گیا کہ لوگوں کو داد و دہش سے قابو میں لایا جائے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو ڈراوہم کا کر ڈینے بند کر کے اور ملازمت سے برخاست کر کے مخالف آوازوں کو کچل دیا جائے۔ یہ کام بڑی تیزی سے مکمل کر لیا گیا۔

دوسری رکاوٹ دور کرنے کے لیے اس نے امام حسن مجتبیٰ ؑ کو قتل کرانے کا فیصلہ کیا اور خرا را ایک عجیب دھوکا بازی کے ساتھ اشعث بن قیس کی بیٹی جودہ کے ذریعے انہیں زہر دلا دیا۔ اب اس نے سمجھا کہ میدان صاف ہو گیا ہے اور اسے یہ احساس نہیں تھا کہ امام حسن مجتبیٰ ؑ کے بعد بھی کوئی رکاوٹ پیش آئے گی۔ بعد میں اسے خیال آیا کہ تمام اسلامی مملکت میں مدینہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور وہاں امام حسینؑ کی مجلسی شخصیت کی موجودگی میں کوئی بھی یزید کی بیعت کرنے پر تیار نہ ہو گا لہذا مجبور ہو کر اس نے ایک اور فریب سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اسلامی مورخین کا کہنا ہے کہ امام حسن مجتبیٰ ؑ کی وفات کے بعد معاویہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ یزید کو ولی عہد مقرر کیا جائے اور اس کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے چنانچہ تمام اسلامی قلمرو کے گورنروں کو مکتوب بھیجے گئے۔ انہی میں سعید بن عاص موحنیانی مدینہ کو لکھا گیا کہ تمام ہماجرین و انصار اور ان کی اولادیں جو مدینہ میں موجود ہیں ان سے سختی کیساتھ بیعت لی جائے اور کوئی روعایت نہ کی جائے۔ البتہ ان چند اشخاص پر دباؤ و تہرؤ ڈالا جائے مگر زبردستی نہ کی جائے: عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور حسین بن علی ؑ۔ معاویہ کی چٹھی ملتے ہی سعید بن عاص نے اہل مدینہ کو بیعت کی دعوت دی مگر سب نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک یہ چند

اشخاص بیعت کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے ہم بھی زبیر کی بیعت کے لیے تیار نہیں۔ سعید نے معاویہ کو لکھا کہ اہل مدینہ ان چند اشخاص کے زبیر تھے اور جب تک یہ بیعت نہیں کریں گے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کی جائے اہل مدینہ سے بیعت لینا ممکن نہیں۔ معاویہ نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں۔ کسی سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں میں خود کچھ فکر کرتا ہوں۔ اسی سال معاویہ نے حج بیت اللہ کا عزم کیا اور شامیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ ملاقات کے بعد موقع پر ان حضرات سے اظہارِ امان و شہود کا کیا اور عتاب امیر گفتگو کی۔ انہوں نے جو یہ نامناسب رویہ دیکھا، الگ الگ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہو گئے لیکن امیر معاویہ نے موسم حج تک مدینہ ہی میں قیام کیا اور اسی دوران میں اہل مدینہ کو نرم کرنے کے لیے ان پر عطا یا اور ہدایا کی بارش کر دی۔ اس کے بعد خود بھی بیعت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں جب لوگ ملنے کے لیے آئے تو عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور حضرت سید الشہداء سے بڑے تپاک اور احترام سے ملاقات کی اور ان سب کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ حکم دیا کہ سب کے لیے سواری حاضر کرو اور ہر ایک کا نام اس کی شخصیت کے مناسب لقب کے ساتھ لیا۔ حسین بن علیؑ کو سید شباب المسلمین کہا۔ عبداللہ بن زبیر کو ابن عم رسول اللہ کہا اور عبدالرحمن کو مولائے قریش وغیرہ وغیرہ۔

مناسک حج کی بجا آوری کے بعد ان سب کو ایک جگہ طلب کیا۔ سب نے امام حسینؑ سے کہا کہ آپ معاویہ سے بات کیجیے لیکن امام حسینؑ آمادہ نہیں ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر سے کہا تو آپ مان گئے۔ سب معاویہ کے پاس پہنچے۔ معاویہ تعظیم اور احترام کا جو حق تھا وہ بجالائے اور کہا تم نے دیکھا کہ میں تم پر کس قدر مسرتاں

ہوں، تم میرے خون و جگر ہو اس لیے میں تم سے لطف و عنایت کا برتاؤ کرتا ہوں۔ اب یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے۔ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ خلافت پر اس کا نام ہو جائے باقی سب معاملات تمہارے ہاتھ میں رہیں۔ تم جو چاہو وہ ہو۔ امر و نہی کا سب اختیار تمہیں ہی رہے گا۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ معاویہ نے پھر کہا جو اب دو۔ پھر بھی کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ معاویہ نے ابن زبیر کی طرف رخ کر کے کہا تم بولو۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا: معاویہ! تم تین میں سے ایک کام کر سکتے ہو یا تو جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کیے بغیر دنیا سے تشریف لے گئے، تم بھی یہی کرو۔ لوگ خود کسی کو خلیفہ مقرر کر لیں گے یا ابوبکر کی طرح کسی ایسے شخص کو جس سے تمہارا کوئی رشتہ نہ ہو اور وہ اس کام کا اہل بھی ہو خلیفہ نامزد کر دو یا پھر عمر کی طرح شوریٰ پر چھوڑ دو۔ معاویہ نے کہا: کیا ان تین کے علاوہ کوئی اور بھی صورت ہے؟ عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ نہیں۔ معاویہ نے دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا وہی جو عبد اللہ بن زبیر نے تجویز پیش کی ہے۔ معاویہ نے کہا بہت اچھا میں کل بات کروں گا مگر کسی کو ٹھیکے بیچ میں ٹوکنے کا حق نہیں۔ اگر میں سچ کوں گا تو میرا ہی فائدہ ہے جھوٹ بولوں گا تو خود ہی جھگڑتوں گا لیکن اگر کوئی مخالفت کریگا تو جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اگلے دن عام جلسہ ہوا جس میں وہ سب لوگ تشریف ہوئے جو تمام بلاد اسلامی سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان چند صاحبوں کو بھی بلایا گیا ہر ایک کے سر پر دو دو مسلح سپاہی تعینات کر دیے گئے۔ معاویہ منبر پر گئے اہل شام انکے اطراف میں جمع ہو گئے۔ معاویہ نے خطبہ دیا اور کہا:

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بے بنیاد بائیں بہت کرتے ہیں کتے ہیں کہ

حسین بن علیؑ، عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے یزید کے لیے بیعت نہیں کی۔ یہ حضرات یہاں موجود ہیں۔ یہ لوگ نمایاں ترین اور سربراہ آوردہ ترین ہیں۔ ان کے بغیر کوئی کام مستحکم ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ ہوتا ہے۔ میں نے خود ان سے بیعت کے لیے کہا اور دیکھا کہ کسی نے بھی کوئی مخالفت نہیں کی۔ سب نے یزید کے لیے بیعت کر لی۔ اس موقع پر اہل شام نے چیخ کر کہا: یہ لوگ کوئی چیز نہیں۔ اگر یہ مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں حکم دیجیے ہم ابھی ان کی گردن مار دیں گے۔ معاویہ نے کہا: جرت ہے لوگ قریش کے اس قدر خلافت کیوں ہو گئے کہ ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ چپ رہو، پھر ایسی بات نہ کہنا۔ یہ کہہ کر معاویہ منبر سے اتر آئے اور ان کے کارگزاروں نے لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دی۔ بعد ازاں معاویہ سوار ہو کر مکہ سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگ گروہ و گروہ حسین بن علیؑ اور دوسروں کے پاس آنے شروع ہوئے اور لگے اعتراض کرنے کہ آپ تو کہتے تھے ہم بیعت نہیں کریں گے پھر کیسے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے بہت کہا کہ ہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ معاویہ نے غلط کہا، دھوکہ دیا مگر لوگوں نے کہا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو اسی جلسہ میں تردید کیوں نہیں کی۔ انہوں نے ہر چند کہا کہ مخالفت کرتے تو مارے جاتے، مگر کچھ اتر نہیں ہوا۔

یہ قصہ ابن عبدالبرہ اندلسی کی عقدا الفرید جلد دوم صفحہ ۲۴۸ ابن قتیبہ کی

المامتہ والسیاستہ جلد اول صفحہ ۱۳۸ اور امالی قالی صفحہ ۷۷ میں مذکور ہے۔

مؤرخ یعقوبی نے عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کی وہ گفتگو نقل کی ہے جو اس وقت ہوئی جب سعید بن العاص والی مدینہ نے بیعت کی تجویز پیش کی۔ یعقوبی کہتا ہے کہ سعید بن العاص نے بیعت کی تجویز پیش کی تو انہوں نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایسے شخص کی بیعت کر لیں جو بندروں اور کتوں سے کھیتا ہے، جو شرابی ہے، زندقہ خراباتی ہے تو ہم خدا کو کیا جواب دیں گے؟

ابن جوزی کہتے ہیں کہ مدینہ کے کچھ لوگ یزید کی رفتار و کردار کا جائزہ لینے کے لیے شام گئے۔ وہاں پر انہوں نے بیان کیا کہ ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جو بے دین ہے، شرابی ہے، سازبجاث ہے اور کتوں سے کھیتا ہے۔ حنظلہ غنیل الملائکہ کا بیٹا عبد اللہ کہا کرتا تھا کہ یزید ایک ایسا شخص ہے جو اپنی ماں، بیٹی اور بہن کو بھی نہیں بخشتا اور شراب پیتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔ مسعودی مروج الذهب میں لکھتا ہے کہ یزید سیہ مست مشہور تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سب مسلمانوں کا فرض تھا کہ اس کی بیعت سے پرہیز کریں کیونکہ بیعت کا مطلب اس کی حرکتوں کی نائید اور اس کی جملہ مساعی میں شرکت تھا۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی کیسا بھی بڑا کرے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہیں چاہے اسلام ہی مٹ جائے اور دین خدا مذاق بن جائے۔ اس مقام پر خاموشی اس خاموشی کی مانند ہے جو سید مرتضیٰ داعی رازی نے تبصرۃ العوام میں ایک صوفی، مردوے سے نقل کی ہے۔

لہ اس بارے میں کتاب تبصرۃ العوام کے سولہویں باب میں مقالات صوفیہ

ملاحظہ فرمائیں۔ جس ہونے کی بنا پر یہ قصہ نقل نہیں کیا گیا۔

امام حسینؑ ایسے موقعوں پر سکوت کو حرام سمجھتے تھے۔ ایک حدیث میں جو انہوں نے کوفہ کے راستے میں لشکرِ حُرّ سے بیان کی اپنے جدِ امجد حضرت رسول اکرمؐ سے یہ جملہ نقل کیا تھا کہ اگر کوئی اس قسم کی باتیں دیکھے اور خاموش رہے تو اللہ کا حق ہے کہ اسے ٹھکانے لگا دے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت سید الشہداءؑ نے معاویہ کی زندگی کے آخری چند سالوں میں بلادِ اسلامی میں منتشر صحابہ اور ان کی اولاد کو خطوط لکھ کر دعوت دی تھی۔ کم و بیش ایک ہزار صحابہ اور تابعین متیٰ میں جمع ہوئے تھے۔ آپ نے اس موقع پر تقریباً کرتے ہوئے فرمایا:

تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے حامیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں لازم ہے کہ اس مجلس میں جو گفتگو ہو واپس جا کر اسے اپنے ہم وطنوں سے بیان کرو۔

اس کے بعد آپ نے اپنے والدِ بزرگوار کے فضائل و مناقب ایک ایک کر کے بیان کیے اور لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی۔ تخف العقول میں جو خطبہ درج ہے اس کے فقروں کے دروہست اور طرزِ خطاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی موقع کا ہے اور ہمیں سے انقلاب کی تخم ریزی شروع ہوئی تھی۔ بات کو واضح کرنے کے لیے ہم اس خطبہ کے جسٹہ جسٹہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امام عالی مقام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آیاتِ الٰہیٰ سنائے کہا:

صاحبو! تم علمِ نیکی اور خیرِ خواہی کے لیے مشہور ہو۔ لوگوں کے دلوں میں تمہاری عظمت ہے۔ شریف تمہارا احترام کرتے ہیں اور کمزور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ وہ بھی جن پر تمہارا کوئی احسان نہیں

تمہیں اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

تم اللہ سے بھلائی کے متمنی ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں غضبِ الہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ کیونکہ تم خدا کے فضل سے ایسے درجے پر ہو جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ تمہاری لوگوں میں عزت ہے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ خدا سے کیے ہوئے وعدے توڑے جا رہے ہیں مگر تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی، حالانکہ تمہارے آباء سے کیے ہوئے وعدوں کی اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو۔ رسول اللہ کی امانت کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بیسیوں میں اندھے، گونگے، اپاہج پڑے پھرتے ہیں جن پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ تم اپنی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے اور جو ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ ظلم کو نظر انداز کر کے اور ظالموں سے نفار نہ کر کے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو۔ اتنی باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے اور دوسروں کو بھی منع کرنے کے لیے کہا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ سب سے زیادہ مصیبت تو تمہاری ہی ہے کیونکہ جو مرتبہ تمہیں ملنا چاہیے تھا اور جو علماء کا حق تھا تم اس سے زبردستی محروم کر دیے گئے ہو۔ کاش تم سمجھتے۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

در اصل انتظام و انصرام اور اجرائے احکام کا کام علماء کے ہاتھ میں ہونا

چاہیے تھا جو حلال و حرام سے واقف اور اللہ کی طرف سے ان کاموں کے نگران ہیں مگر تم سے تمہارا مرتبہ چھین لیا گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ تم حتیٰ سے دور ہو گئے اور واضح دلائل کے باوجود سنت کے بارے میں تم میں اتفاق نہیں۔ اگر تم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے اور تکلیف برداشت کرتے تو سب اختیارات تمہارے ہی ہاتھ میں ہوتے لیکن تم نے اپنی جگہ ظالموں کو دیدی اور سب اختیار انھیں سونپ دیا جو مشتبہ طریقوں پر چلتے اور اپنی بیہودہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اس لیے تم پر مسلط ہو گئے کہ تم موت سے بھاگتے تھے اور تمہیں زندگی عزیز تھی جو بہر حال فانی ہے۔ تم نے کمزوروں کو ان کے ہاتھ میں دیدیا تو کچھ بیچارے غلام بن کر رہ گئے اور کچھ نان بھوں کو محتاج ہو گئے۔ اب وہ سارے ملک میں من مانی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات پر چل کر سوائی سمجھتے ہیں۔ برے لوگوں کے طریقے اپناتے ہیں اور خدا کی پروا نہیں کرتے۔ ہر بستی میں منبر پر ان کا خطیب جینتا ہے۔ وہ خدا کی زمین کے بلا شرکت غیرے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں اور سب لوگ ان کے زیر دست ہیں۔ وہ جس پر چاہیں ہاتھ ڈالیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ سرکش، ہٹ دھرم اور غریب آزار ہیں۔ کچھ خدا و یوم آخرت سے بیگانہ، کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ملک ایسے ظالموں کے ہاتھوں میں ہے جن کا کام صرف لوٹ کھسوٹ ہے اور ایسے لوگ حاکم بنے بیٹھے ہیں جنہیں مومنوں پر رحم نہیں آتا۔ اب ہمارا ان کا قبضہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو عوام میں مقبول اور ممتاز تھے اور اس لیے ان کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ تھی مگر وہ اپنے فرائض کی بجب آوری میں کوتاہی کر رہے تھے اس لیے ملامت کے مستحق تھے۔ اب یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں



امام عالی مقام نے دعوت دیکر بلایا تھا اور ان سے منیٰ میں خطاب فرمایا تھا جو حرم میں داخل ہے اور جائے امن ہے۔ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ آپ مدینہ میں وہاں کے بقیہ باقیہ ہماجرین و انصار سے جو اس وقت سربراہ اور وہ سمجھے جاتے تھے باقاعدہ منبر پر جا کر خطاب کریں اور حاکم وقت معترض نہ ہو۔ بعد کے مضمون سے بھی ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے قرآن کی موجودگی میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خطاب مکہ میں معاویہ کی وفات کے بعد کیا گیا ہو۔

اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید کی بیعت کا تفسیر پیش آنے سے پہلے ہی آپ کو انقلاب لانے کا خیال تھا اور آپ صرف مناسب موقع کے انتظار میں تھے اس لیے آپ کی تحریک کا آغاز اسی دعوت سے سمجھنا چاہیے جو آپ نے صحابہ و تابعین کو سننی میں دی تھی۔ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا اور لوگوں کو حتیٰ کی طرف بلانا کوئی آسان کام نہ تھا اور یہ کام محض مراسلت، تقریروں اور پیغاموں سے انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اسی لیے امام حسینؑ نے چاہا کہ ایسا انقلاب برپا کیا جائے کہ تمام بلاد اسلامی کے لوگوں پر یہ بات آشکارا ہو جائے کہ یزید کے برسر اقتدار رہنے کی صورت میں اسلام کی بقا کو سنگین خطرہ ہے۔ جن لوگوں کے آباء و اجداد بیس سال سے زیادہ مدت سے معاویہ کو رسول اکرمؐ کا ایک بزرگ صحابی سمجھتے آرہے تھے یا کم از کم اس کے جھوٹ اور نفاق کے بارے میں مذہب تھے انہیں گفتگو، پیغام اور تقریروں سے بیدار کرنا اور صحیح اسلامی حکومت کے بارے میں کچھ سمجھانا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ معاویہ کے مبلغ ہر شہر و دیار میں پردہ پگینڈا کرنے اور لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے میں مصروف تھے۔

حجر بن عدی، رشید بھری اور عمرو بن جحش خزاعی جیسے لوگ مارے جا رہے تھے اور کسی کو لب کشائی کا بار نہ تھا بلکہ اس کے برعکس عوام تو ان ہی لوگوں کو مجرم سمجھتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ تحریک اتنے بڑے پیمانے اور موثر انداز میں ہو کہ اس کا انقلابی اثر مدتوں فراموش نہ کیا جاسکے حتیٰ کہ حالات درست ہو جائیں اور بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے اور چونکہ بنی امیہ کی بالعموم اور البغیان کی اولاد کی بالخصوص یہ دیرینہ آرزو تھی کہ لوگ رسول اکرمؐ کا نام لینا اور حقیقی اسلام کو پچھنا چھوڑ دیں لہذا ان کی نیت ظاہر ہو جائے اور لوگ انہیں پہچان لیں اور ان کے مخالفین کے ساتھ مل جائیں اور جنگ شروع ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ امامؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ مدینہ سے روانگی کے وقت جو وصیت نامہ لکھ کر آپ نے محمد بن حنفیہ کو دیا تھا اس میں توحید و رسالت اور حشر و نشر کے اقرار کے بعد لکھا تھا:

إِنِّي لَمْ أَحْرَجْ إِشْرًا وَلَا بَطْرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا  
وَأِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلْبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةٍ جَدِي  
أُرِيدُ أَنْ أَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَ  
أَسِيرُ بِسِيْرَةِ جَدِّي وَأَبِي -

”یعنی میں سرکشی اور جنگ و جدل کے ارادے سے نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد فساد پھیلانا یا کسی پر ظلم کرنا ہے بلکہ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں میری غرض فقط امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اپنے آب و جد کی پیروی ہے“

جب آپ نے روانگی کا تمیز کر لیا تو آپ کئی بار اپنے نانا کے روضے پر گئے اور یہ

حمد کہا:

”اللَّهُمَّ إِنِّي أَحِبُّ الْمَعْرُوفَ وَأُبْغِرُ الْمُنْكَرَ“

”خدا یا مجھے نیکی پسند ہے اور بُرائی سے نفرت ہے“

امام حسینؑ نے یہ جانتے ہوئے جہاد شروع کیا تھا کہ آپ تو ضرور قتل ہوں گے اور آپ کے زن و فرزند بھی اسیر ہو جائیں گے لیکن آپ کی جد و جہد کے نتیجے میں اسلام اور اس کے احکام باقی رہیں گے اور باطل قوتوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔ مزید جسے سابق خلفاء کی روایت کے برخلاف لوگوں پر مسلط کیا گیا تھا یہ عمل دہرا نہیں سکے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید برسرِ اقتدار آجائے اور معاویہ کی سکیم دھری رہ جائے گی۔ لوگ خواب سے بیدار ہو جائیں گے۔ ان میں اسلامی شعور پیدا ہوگا اور سنی امپیرسرا ہو جائیں گے اور آپ کا لامتناہی ہمیشہ ظلم و ستم کے یوانوں میں زلزلہ برپا رکھے گا۔

مکن ہے اس موقع پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ  
وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ یعنی اپنی جانوں کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو“ اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ امام سے بڑھ کر ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے! ان کا فعل تو خود حجت ہے۔ رہی یہ بات کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں تو ابو عبد اللہ کا جہاد اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ راہِ خدا میں مارا جانا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے تو پھر رسول اکرمؐ کے اکثر غزوات بھی اسی شمار میں آجائیں گے۔ اسلام کی ابستدائی جنگوں میں جب مسلمان ابھی بہت کمزور تھے یہ حکم تھا کہ بیس آدمی دوسو کا مقابلہ

کریں۔ اس لحاظ سے یہ بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہونا چاہیے حالانکہ کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں سمجھتا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ راہِ خدا میں جہاد نہ کرو کیونکہ اگر مالے جاؤ گے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والے قرار پاؤ گے۔ یہ آیت تو اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب مسلمانوں کو حکم تھا کہ جنگ کی صورت میں اپنی حیثیت کے مطابق ساز و سامان ہتھیار، خوراک اور سواری مہیا کریں۔ بظاہر کچھ لوگ اس سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لینے لگے تھے اور جتنا مال خرچ کرنا چاہیے تھا اتنا مال خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے چنانچہ اس موقع پر یہ آیت اتری:

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ  
إِلَى التَّهْلُكَةِ

یعنی ”راہِ خدا میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو دستنی یا کجوسی کے سبب ہلاکت میں نہ ڈالو“

یہ مطلب اس روایت سے ظاہر ہے جو ایک بزرگ صحابی حذیفہ بن ایمان سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ”فَزَلْتُمْ فِي النَّفَقَةِ“ انفاق کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس روایت کو ابن ابی حاتم اور بخاری نے حذیفہ اور اعمش سے اور سیوطی نے ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، سدّی اور مقاتل بن حبان سے نقل کیا ہے۔ یہ سب صحابہ اور تابعین میں سے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں اسلم بن یزید الجعفری کہتے ہیں کہ محاصرہ قسطنطنیہ کے دوران ہمارے لشکر کے ایک سپاہی نے دشمن کی صفوں پر بڑی بے جا بے جا

حملہ کر کے دشمن کی صف میں شگاف ڈال دیا۔ ہماری طرف سے کچھ لوگوں نے چیخ کر کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابوالیوب انصاریؓ ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس آیت کے معنی بہتر جانتے ہیں۔ تم ایسے ہی تنکے مارتے ہو۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہیں رسول اکرمؐ کی ہمانداری اور مصاحبت کا شرف حاصل ہے۔ جب اسلام نے ترقی کر لی تو ہم یہ سمجھ کر رسول اکرمؐ کی امداد میں تساہل برتنے لگے کہ اسلام کو تو فروغ حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اپنے بیوی بچوں کی فکر کرنی چاہیے۔ ہم رسول اکرمؐ کی اعانت میں ٹال مٹول کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

”وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى  
التَّهْلُكَةِ“ فَكَانَتْ التَّهْلُكَةُ فِي الْإِقَامَةِ فِي  
الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَتَرْكِ الْجِهَادِ۔

یعنی ”راہِ خدا میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔  
بیوی بچوں میں اپنے مال کو خرچ کرنے اور ترکِ جہاد میں ہلاکت  
بھٹی۔ پس ہلاکت ترکِ جہاد میں ہے، جہاد میں نہیں۔“

یہ روایت ابو داؤد سجستانی، ترمذی، نسائی، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم،  
ابن جریر طبری، ابن مردویہ، ابویعلیٰ اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نیشاپوری نے  
مستدرک میں، یزید بن ابی حبیب عن اسم کے طریق سے نقل کی ہے۔ ترمذی  
نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

ایک اور روایت ابواسحاق سلیمی سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص  
نے براہِ بن عازب سے دریافت کیا کہ اگر میں لڑائی کے دوران میں اکیلا

دشمن پر حملہ کر دوں اور مارا جاؤں تو کیا یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہوگا؟

براء نے کہا: نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تَكْلَفُ إِلَّا نَفْسَكَ . (سورہ نساء - آیت ۸۴)

یعنی ”اللہ کی راہ میں لڑو۔ تم فقط اپنے نفس کے ذمے دار ہو“

اس کے بعد براء نے کہا کہ یہ آیت جنگ کے موقع پر انفاق کے بارے میں

ہے۔ یہ روایت ابن مرویہ اور حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں بیان کی ہے۔

حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (شیخ محمد بن اسماعیل بخاری اور شیخ مسلم بن حجاج

نیشاپوری) کے معیار کے مطابق ہے۔

اسی قسم کا قول تفسیر برہان میں تفسیر عیاشی کے حوالے سے حذیفہ بن یمان

کی روایت میں نقل کیا گیا ہے۔ سید بن طاووس نے بھی ہوف میں اس آیت کے

یہی معنی بیان کیے ہیں اور انہی روایات سے استناد کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس ہلاکت والی آیت کے سیاق و سباق سے بھی ظاہر ہوتا

ہے کہ یہ دفاعی جہاد کے بارے میں ہے۔ سیاق و سباق پر ایک نظر ڈالنے سے

مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ راہِ خدا میں جان دینے کو شریعت کی اصطلاح میں

ہلاکت سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ قرآن پاک شہدائے اسلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا

بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ○ (سورہ آل عمران - آیت ۱۶۹)

یعنی ”تم گمان بھی نہ کرو کہ کشنکان راہِ خدا مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں

اور اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں“

بج البلاغہ کے خطبے میں جو امیر المؤمنینؑ نے واقعہ ۲ صفین کے موقع پر اپنے اصحاب کے سامنے دیا تھا، فرمایا:

”مغلوب ہو کر زندہ رہنے میں تمہاری موت ہے اور غالب آ کر مر جانے میں زندگی“

وہ زندگی جو انسان کو ہر کس و ناکس کے سامنے جھکا دے ہزار بار مرنے اور ہلاک ہونے سے زیادہ سخت اور بدتر ہے۔ امام حسینؑ اپنے پدر بزرگوار اور برادر نامدار کی طرح سادہ طور پر شہید ہو جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ایسی شہادت پر کوئی توجیہ بھی نہ دیتا اور امامؑ کا خون رائیگاں چلا جاتا۔

وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ امام عالی مقامؑ اپنے انجام سے آگاہ نہیں تھے۔ ان روایات سے قطع نظر جن میں آیا ہے کہ جو امامؑ یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا پیش آنے والا ہے وہ حجت نہیں ہو سکتا اور یہ کہ سب امام جانتے ہیں کہ انہیں کب موت آنے لگی اور ان کا مرنا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔

خود سید الشهداءؑ کی شہادت کا مسئلہ خاوندہ بنی ہاشم خصوصاً امیر المؤمنینؑ کے گھرانے میں معلوم و معروف تھا۔ ام سلمہؓ، ام ایمن وغیرہ نے خود رسول اللہؐ سے سنا تھا کہ حسینؑ کو بلا میں شہید ہوں گے۔

علاوہ ازیں اس خطبے میں جو آپ نے اپنی روانگی سے قبل رات کو حرم کعبہ میں دیا تھا، آپ نے فرمایا تھا: ”حُطِّ الْمَوْتُ عَلَىٰ وَلَدِ آدَمَ“ یعنی موت بنی آدم کا مقدر ہے۔ اگر آپ کو اپنی شہادت کا علم نہ ہوتا تو آپ یہ نہ فرماتے کہ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا صحرائی پھیرے لگا دیں اور بلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے کیے ڈال رہے ہیں“ اسی طرح اور بہت سے موقعوں پر آپ کی گفتگو

سے واضح ہو جاتا ہے کہ سارا معاملہ روزِ روشن کی طرح حضرت امام حسینؑ کے علم میں تھا۔ اس سے انکار سخن سازی اور کٹ جھتی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد بن حسن بن فروخ صفار نے بصائر الدرجات کے آئینہ میں اور اسی طرح کلیبی نے الکافی میں بیان کیا ہے کہ اہل کوفہ میں سے ایک شخص ثعلبہ بن امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا (بظاہر اس نے امامؑ کو کوفہ جانے سے منع کیا تھا اور خوف دلایا تھا) تو امامؑ نے فرمایا:

”اگر تم سے مدینہ میں ملاقات ہوئی ہوتی تو اپنے نانا کے پاس جبریل کے وحی لانے کے آثار تمہیں اپنے گھر میں دکھاتا۔ اے کوفی بھائی! علوم کا سرچشمہ تو ہمارے پاس ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اور لوگ تو جانتے ہوں اور ہم ناواقف ہوں“

نیز آپ نے مدینہ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا:

”مَنْ لِحَقِّ بِي مِنْكُمْ أُسْتَشْهِدُ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنِّي لَنْ يَبْلُغَ الْفَتْحَ“

”جو میرے ساتھ چلے گا، شہید ہوگا اور جو پیچھے رہ جائے گا اسے کامیابی میں حصہ نہیں ملے گا۔“

اور اگر کوئی یہ کہے کہ سید مرتضیٰ رحمہ اللہ سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام حسینؑ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ مارے جائیں گے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے یہ نقل ہوا ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ مارے جائیں گے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب انہیں معلوم تھا کہ میں مارا جاؤں گا تو پھر وہ اپنے بیوی بچوں کو کیوں ساتھ لے گئے اور انہیں کیوں قید کرایا تو اس کا جواب



وہی ہے جو ہم پہلے کہ چکے ہیں کہ ان کا مقصد اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو قتل کرانا نہیں تھا۔ ان کے قیام کا مقصد لوگوں کی توجہ بنی امیہ کی برائیوں کی طرف مبذول کرانا تھا اور انہیں یہ بتانا تھا کہ بنی امیہ کی حکومت اسلامی حکومت نہیں ہے اور ان کا مقصد اسلام کو اور بالخصوص حضرت محمد بن عبد اللہ کے نام کو مٹانا اور نیست و نابود کرنا ہے لہذا انہوں نے صحیح پروگرام کے مطابق قدم اٹھایا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ بنی امیہ یہ نہیں چاہتے کہ بنی ہاشم کا ایک فرد بھی زندہ رہے حتیٰ کہ طفل شیر خوار کو بھی تیر کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے اور اہلبیت پیغمبر کے ساتھ اتنی سختی کرتے ہیں جتنی ترکی اور ولیم کے مشرک قیدیوں کے ساتھ بھی نہیں کی جاتی اور ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اسلام اور آثار نبوت کو نابود کر دیں اور حکومت پر قبضہ جائے رکھیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں، لوگ بنی امیہ کی حرکتوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ وہ زیادہ تر غلط فہمی میں مبتلا تھے اور انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ معاویہ کو جس نے اپنی زیادہ تر عمر کفر و شرک کے اندھیرے میں گزاری تھی اور فتح مکہ کے موقع پر یہ امر مجبوری ظاہر طور پر ایمان لے آیا تھا، عمار بن یاسر و الشہداء تین اور ابن تیمان بلکہ علی ابن ابی طالب کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ ربیع بن خثیم جو ایک مشہور و ممتاز تابعی تھے اور جن کا شمار زیادہ ثمانیہ میں ہوتا ہے، جنگ صفین کے موقع پر امیر المؤمنین کے پاس آئے اور کہا:

”يَا امِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اِنَّا شَكَلْنَا فِي هَذَا الْقِتَالِ  
عَلَى مَعْرِفَتِنَا بِفَضْلِكَ“

”اے امیر المؤمنین! ہم آپ کے مرتبہ اور فضل و کمال سے تو واقف

ہیں لیکن ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے کہ حق کس طرف ہے؟  
اسی قسم کے لوگ اور بھی بہت تھے جن پر عوام کی نظریں مگی رہتی تھیں اور جن  
کی لوگ اتباع کرتے تھے۔ رائے عامہ کو پوری طرح گمراہ کر دیا گیا تھا، خصوصاً اہل شام  
اور وہ لوگ جو معاویہ کے زیر اثر عجیب غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔

نصر بن مزاحم نے بیان کیا ہے کہ ہاشم مرقال اور کوفہ کے قاریوں کی ایک  
جماعت دشمن کے ساتھ جنگ میں مشغول تھی کہ ایک عسائی جوان میدان میں  
آیا اور رجز پڑھنے اور امام علیؑ پر لعنت کرنے لگا۔ ہاشم مرقال نے کہا کہ: اے  
جوان! خدا سے ڈر۔ آخر خدا کو منہ دکھانا ہے۔ وہاں ہر رات کا جواب دینا پڑے  
گا۔ اس نے پلٹ کر کہا:

”لَا اِنَّ صَاحِبِكُمْ لَا يُصَلِّيْ كَمَا ذَكَرْتَنِيْ وَاِنَّكُمْ  
لَا تَصَلُّوْنَ“

”میں ضرور تم سے لڑوں گا کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارا امیر نماز  
نہیں پڑھتا، نہ تم پڑھتے ہو“

ہاشم نے اسے سمجھایا اور اس کی غلط فہمی دور کی تو وہ واپس چلا گیا۔  
کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کے آغاز سے بیس برس قبل لوگ  
امیر المؤمنینؑ کے فضائل و مناقب میں اتنی احادیث کے باوجود آپ کے مرتبے سے  
ناواقف تھے۔ بیس سال بعد تو حالات بالکل ہی دگرگوں ہو چکے تھے۔ معاویہ نے  
اسلامی حقائق کو مسخ کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا۔ تمام اسلامی علاقوں میں اس کے

کارندے اس کے احکام کو عملی شکل دے رہے تھے اور دین کی بنیاد بالکل ڈھے گئی تھی۔ جائز چیزیں ناجائز ہو گئی تھیں اور ناجائز جائز ہو گئی تھیں اور یزید کی حکومت میں تو آثار اسلامی کے بالکل ہی مٹ جانے کا امکان تھا۔ خود امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا:

”إِذَا بَلِيَّتِ الْأُمَّةُ بِرَأْعِ مِثْلِ يَزِيدٍ فَعَلَى  
الْإِسْلَامِ السَّلَامُ“

یعنی ”جب امت پر یزید جیسے حکمران مسلط ہو جائیں تو اسلام کا  
خدا ہی حافظ ہے۔“

اور وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ابام عالیہ تقام کو کوفیوں نے دعوت دی تھی اور چونکہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ مبادا حرم ہی میں قتل کر دیے جائیں اور حرم کی بے حرمتی ہو، اس لیے آپ نے کوفیوں کی دعوت قبول کر لی اور وہیں سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اگر کوئی دعوت نہ دیتے تو شاید آپ یہ اقدام نہ کرتے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل کوئی تحریک تھی ہی نہیں بلکہ ایک مجبوری کا فیصلہ تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملنے پر تو یقین ہو گیا تھا کہ کوئی وفادار نہیں ہیں اور ان سے مدد کی کوئی امید نہیں۔ پھر آپ وہیں سے واپس ہو کر صحرا میں روپوش کیوں نہ ہو گئے۔ اس وقت تک تو لشکرِ حرم بھی نہیں پہنچا تھا بلکہ اس لشکر سے بڑھنے کے بعد بھی واپس ہو سکتے تھے۔ آپ اس لشکر کا مقابلہ بھی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے وہ آتشیں خطبہ کیوں دیا جو طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے جس میں آپ نے کہا تھا:

مَنْ رَأَى سُلْطَانًا جَائِرًا مُسْتَجِلًّا لِحَرَمِ اللَّهِ

## نَاكِثًا لِعَهْدِ اللَّهِ

”جو شخص ظالم فرما کر اور کو حرام چیزوں کو حلال کرتے اور اللہ کے عہد کو توڑتے دیکھے.... الخ“

اگر صرف اہل کوفہ کی دعوت قبول کرنے کا سوال تھا تو پھر آپ نے مکہ سے روانہ ہونے سے پہلے بصرہ کے پانچ سرداروں یزید بن مسعود، ہنشلی، مالک بن مسمع، احنف بن قیس، منذر بن جارد اور مسعود بن عمرو کو خطوط کیوں لکھے اور ان سے امداد کیوں طلب کی؟

معلوم یہی ہوتا ہے کہ آپ ایسا انقلابی قدم اٹھانا چاہتے تھے جس کی گونج پورے عالم اسلامی میں سنائی دے اور معروف دشمن اپنی کامیابی کے نشے میں اہل بیت پیغمبر کو مختلف شہروں میں پھرائے تاکہ لوگ انہیں نزدیک سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ بنی امیہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے اور آل رسول کی مظلومیت عالم آشکارا ہو جائے تاکہ بنی امیہ کی جڑیں کٹ جائیں، ورنہ گزشتہ بیس سال کے یکطرفہ پروپیگنڈے کے بعد انہیں حق و باطل میں تمیز کا موقع کہاں ملتا۔ شامیوں نے تو شاہد حسینؑ کا نام بھی کبھی عزت و احترام سے نہیں سنا تھا اس لیے عوام کو بیدار کرنے کی اور کوئی صورت بجز اس کے نہیں تھی کہ علی بن حسینؑ اسی منبر سے جس پر سے علی بن ابی طالب کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا رہا تھا۔ علیؑ کے فضائل و مناقب بیان کریں اور اہل شام میں یزید کے خلاف شورش پیدا کی جائے تاکہ ان کے والد اور ہمسایوں کے قتل کا قصہ برسوں ہر محفل اور ہر مجلس میں موضوع سخن ہے۔ جب امیر المومنینؑ محراب مسجد میں شہید کیے گئے تو توامی حیرت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اچھا! علیؑ نماز بھی پڑھتے تھے جو مسجد میں آئے اور وہاں محراب

یہیں مارے گئے۔

ممکن ہے کہ کوئی اعتراض کرے کہ اگر واقعی آپ کا تحریک چلانے کا خیال تھا تو پھر آپ نے روزِ عاشورہ کیوں کہا کہ ”مجھے جانے دو“ میں کسی امن کی جگہ چلا جاؤں گا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ بطری میں اس قسم کی ایک روایت ضرور موجود ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ امامؑ نے یہ فرمایا تھا کہ میں تحریک ہی سے دستکش ہو جاتا ہوں اور اب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کروں گا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کوئیوں نے آپ کو دعوت دے کر بلایا تھا اور اب وہ اپنی دعوت سے پھر گئے تھے اس لیے آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی باتوں اور خطوط پر پیشیمان ہو تو کوئی بات نہیں، میں واپس چلا جاتا ہوں۔ یہ نہیں کہ تحریک ہی سے دستبردار ہوتا ہوں۔

رہی یہ بات کہ آپ نے مختلف لوگوں سے مدد کیوں طلب کی تو وہ یہ ہے کہ جن کو آپ نے مدد کے لیے دعوت دی تھی وہ عموماً ایسے عراقی تھے جو اپنے شہر اور دیار میں صاحبِ اثر و رسوخ تھے۔ اب چاہے وہ مدد کے لیے حاضر ہوتے ہوں جیسے زہیر بن قین اور ضحاک وغیرہ یا حاضر نہ ہوتے ہوں سب ہی آتشِ انقلاب کو بھڑکانے میں موثر ثابت ہوئے۔ ضحاک مشرقی کوچھبے انہوں نے عاشوراکے واقعات پہنچتم خود دیکھے اور بعد میں ہر شخص کے سامنے کوفہ میں ان واقعات کو نقل کرتے رہے۔ روزِ عاشوراکے اکثر واقعات ضحاک ہی سے منقول ہیں۔ یہ صاحبِ صحیح معنوں میں وقائع نگار اور امامؑ کے پیگ ریلیشن آفیسر ثابت ہوئے ورنہ جسے یقین ہو کہ مرنے کے لیے جا رہا ہوں اسے کسی کی چند ساعت کی رفاقت سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ ایک دوسرے صاحبِ عبید اللہ بن حمر جعفری تھے جو عین

میں معاویہ کے ساتھی اور خون عثمان کے بدلے کا مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ اگر چہ امام کی مدد کے لیے حاضر نہیں ہوئے اور معذرت کر دی لیکن جب طبیعت کوفہ سے شام کے لیے روانہ ہوئے تو ابن زیاد نے انشرف کوفہ کے ایک ایک فرد کو بلایا اور ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ عبید اللہ بن حرم نہیں آئے۔ چند روز بعد کوفہ میں آکر ابن زیاد سے ملے۔

ابن زیاد نے پوچھا: ”تم کہاں تھے؟ تم نے ہماری مدد کیوں نہیں کی؟“  
کہا: ”میں بیمار تھا۔“

ابن زیاد نے کہا: ”تمہارا دل بیمار تھا یا جسم؟“

کہا: ”دل تو قطعی بیمار نہیں تھا، ہاں میں خود ضرور بیمار ہو گیا تھا۔ چند روز میں اللہ نے شفا دی۔“

ابن زیاد نے کہا: ”تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو ہمارے دشمن کے ساتھ تھا۔“  
عبید اللہ نے کہا: ”اگر میں تمہارے دشمن کے ساتھ تھا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا“  
چھپ تو سکتا نہیں؟“

راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد سے آنکھ بچا کر عبید اللہ بن حرم باہر کھسک گئے۔ ابھی گھوڑے پر سوار ہی ہوئے تھے کہ ابن زیاد کو خیال آگیا۔ اس نے کہا، ”یہ عبید اللہ کہاں چلا گیا، اسے بلاؤ۔ پاس بانوں نے عبید اللہ کو باہر تلاش کر کے ان سے کہا کہ تمہیں امیر بلارہے ہیں، ان کے پاس چلو۔ عبید اللہ نے گھوڑے کو اڑھائی گائی اور کہا امیر سے کہہ دو کہ اب کبھی میں اپنی خوشی سے اس کے پاس نہیں آؤں گا۔ وہاں سے نکل کر سیدھے احرار بن زیاد طائی کے مکان پر آئے۔ وہاں انکے اور دوست احباب بھی اکٹھے ہوئے اور سب ملکر کربلا پہنچے۔ وہاں قبور شہداء کی زیارت کی اور حج عم

کا اظہار کیا۔ کچھ شعر امامؑ کے مرثیے کے کہے۔ شاید یہی پہلے شخص تھے جو امامؑ کی قبر کی زیارت کے لیے گئے اور جنہوں نے امامؑ کا مرثیہ کہا۔

بعد میں مختار کی ہمراہی میں امامؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے نکلے اور آخر دم تک حکومتِ وقت کی مخالفت میں سرگرم رہے صاحبِ رجال نجاشی نے ان کا شمار سلفِ صالحین میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب میں امیر المؤمنین کے خطبات جمع کیے تھے۔

ایک اور صاحب جن سے امامؑ نے مدد طلب کی تھی زہیر بن قین تھے۔ یہ اشرفِ کوفہ میں سے تھے اور اپنے قبیلہ بجیلہ میں بااثر تھے، چونکہ یہ بھی جنگِ صفین کے موقع پر طالبانِ قصاص عثمان میں سے تھے اور بعد میں بھی کوفہ میں حکومت کے طرفداروں میں رہے تھے اس لیے جب یہ امامؑ سے مل گئے تو دوسروں پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے مارے جانے سے کوفہ کے کئی قبیلوں کو صدمہ ہوا اور اس کے نتیجے میں انہوں نے حکومتِ وقت کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور انتقام لینے کے لیے موقع کے منتظر رہنے لگے۔ صرف زہیر ہی کا قتل قبیلہ بجیلہ اور اس سے وابستہ دوسرے قبائل کے غیظ و غضب کا سبب نہیں ہوا بلکہ کوفہ اور بصرہ کے چھٹے لوگ امامؑ کی ہمراہی میں مارے گئے ان کے قتل نے اکثر قبائل کو صدمہ پہنچایا کیونکہ یہ سب ایمان و اشرف میں سے تھے۔ ان کی موت سے ان دونوں شہروں کے اکثر قبیلے سوگوار ہو گئے اور ان کا خون حکومت کو بہت مہنگا پڑا۔ اسی دن سے شیعانِ کوفہ کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ انہوں نے ایک خفیہ پارٹی بنائی۔ ہر شب کسی ایک کے گھر میں جمع ہو کر شہداء کو یاد کرتے اور گریہ و بکا کرتے چپکے چپکے لوگوں سے حکومت کی مخالفت اور خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کا عہد لیتے۔ روز بروز ان لوگوں

کی تعداد بڑھتی گئی اور عراق کے سیاسی حالات خطرناک سے خطرناک تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ تین سال بعد جب یزید ہلاک ہو گیا تو ان کی تحریک کھل کر سامنے آئی۔ عمرو بن حمزہ کو جو کوفہ کا عامل تھا گرفتار کر کے باہر نکال دیا گیا۔ لوگوں نے مسجد کوفہ میں جلسہ کیا جس میں سب سردارانِ قریش شریک ہوئے اور عارضی حکومت کے لیے چند اشخاص کا نام تجویز کیا گیا جن میں سے ایک بقول طبری عمرو بن سعید تھا یا جیسا کہ حاج فرہاد مرزائی نے مقام میں لکھا ہے عمرو بن سعید تھا۔ یہ سن کر قبیلہ ہمدان کی عورتیں باہر نکل پڑیں اور گریہ و زاری کی صدائیں بلند کر دیں۔ بعد میں قبیلہ نضج، ربیعہ اور کھلان کی عورتیں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ شمشیر بستہ مردان کے گرد پھر دسے رہے تھے۔ عورتوں نے مسجد میں منبر کے گرد جمع ہو کر گریہ و بکا کیا اور کہا کہ یہی کافی نہیں کہ عمر بن سعد نے زہراؑ کے لالہ کو قتل کر دیا، اب وہ جا رہے سر پر سواد ہونا اور کوفہ کا امیر بننا چاہتا ہے۔ ان خواتین نے کوفہ میں باقاعدہ مصائبِ سید الشہداءؑ کی یاد تازہ کی۔ اس سے پہلے کوفہ کی جامع مسجد میں شہدائے کربلا کی یاد میں مجلس عزائم عقد نہیں ہوئی تھی۔

بصرہ میں بھی کوفہ کی طرح ہنگامہ ہوا۔ ہر طرف سے ابن زیاد کی مخالفت شروع ہو گئی اور اسے بھیس بدل کر وہاں سے شام کی طرف بھاگنا پڑا۔ مکہ میں عبد اللہ بن زبیر نے اپنے لیے بیعت لینا شروع کر دی۔ شام میں ایسا عجیب انقلاب آیا کہ امیر معاویہ کی وہ ساری کوششیں بیکار ہو گئیں جو انہوں نے اپنے

لے غالباً یہ دوسرا نام ہی صحیح ہے۔ طبری کو تسامح ہوا ہے یا کمات کی غلطی ہے کیونکہ عمرو بن سعید نامی کوئی شخص امام حسینؑ کے قتل میں شریک نہیں تھا۔



خاندان میں خلافت مستحکم کرنے کے لیے کی تھیں اور تین چار سال کی محسوس مزیدری حکومت کے بعد پھر آل ابی سفیان میں سے کسی کو مسترِ خلافت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ اب یہی بات کہ آپ نے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت کیوں دی اور اس پر اصرار کیوں کیا تو یہ ظاہر ہے کہ امام کسی ایسے شخص کو جو دنیاوی الملج میں آپ کے ساتھ ہو گیا تھا دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ جان دینے پر آمادہ ہوں، وہ اپنے عقیدے پر بالکل پختہ ہوں اور جو کچھ کریں گے اور لائے نہ کریں، علی وجہ البصیرت کریں۔ کسی پر کوئی زبردستی نہ کی جائے۔ یہ بھی اسلام کی ایک خصوصیت ہے کہ اسلام کے سب سپاہی بیدار اور ہوشیار ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق و باطل میں کس قدر فرق ہے۔ جھوٹے مدعی اپنے مریدوں کو کبھی آسانی سے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے لیکن مردانِ حق کا یہ شیوہ نہیں۔ وہ لوگوں کو اجازت دیتے ہیں کہ اپنی مرضی کے مطابق جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔ صرف انہیں یہ بتا دیتے ہیں کہ خیر کا راستہ یہ ہے اور شر کا راستہ وہ ہے۔

اس سفر سے حضرت سید الشہداء کا مقصد ریاست و سلطنت حاصل کرنا نہیں تھا کہ جس طرح بھی ہو سکتا ان سب کو جو آپ کے ساتھ آگئے تھے مختلف جیلے بہانوں سے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے اور کسی کو جدانہ ہونے دیتے۔ آپ نے صاف فرما دیا تھا:

لے ملاحظہ فرمائیں کتاب ”فلسفہ شہادت“ مؤلفہ مرتضیٰ امطری۔ مطبوعہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

أَلَا وَإِنِّي لَأَظُنُّ يَوْمَنَا مِنْ هُوَ لَاءِ الْأَعْدَاءِ غَدًا  
وَإِنِّي قَدْ أَذِنْتُ لَكُمْ فَأَنْطَلِقُوا جَمِيعًا فِي  
حِلٍّ لَيْسَ عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِمَّةٌ وَهَذَا اللَّيْلُ  
قَدْ غَشِيَكُمْ فَأَتَّخِذُوهُ جَمَلًا .

”میرے خیال میں کل دشمن سے جنگ ہوگی۔ میں نے اپنی بیعت کی پابندی تم پر سے اٹھالی ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چلے جاؤ۔“

آپ کے اصحاب اور بنی ہاشم نے بھی کیا خوب جواب دیا۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا:

”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي شَرَّفَنَا بِالْقَتْلِ مَعَكَ وَلَوْ  
كَانَتْ الدُّنْيَا بَاقِيَةً وَكُنَّا فِيهَا مُحْكَمِينَ لَأَثَرْنَا  
النُّهُوضَ مَعَكَ عَلَى الْإِقَامَةِ فِيهَا“

”اللہ کا شکر کہ جس نے ہمیں آپ کی معیت میں شہادت کا شرف عطا کیا۔ اگر بالفرض محال دنیا جاودانی بھی ہوتی تو بھی اس دنیا میں زندہ رہنے پر ہم آپ کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتے“

اس کے علاوہ امامؑ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان لوگوں کا امتحان لیں اور ان پر انعامِ حجت کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون برصا و رغبت ہمارے ساتھ ہے اور کون مجبوراً ساتھ دے رہے تاکہ کل کوئی لیشانی کا اظہار نہ کر سکے اور یہ نہ کہہ سکے کہ میں تو پھینس گیا تھا اور نہ دشمن ناہنجر کے مقابلے میں کمزوری دکھائے۔ نیز دشمن بھی یہ نہ کہہ سکے کہ حسینؑ بن علیؑ نے ریاست و دنیا داری کے لالچ میں اپنے ساتھیوں

کو دھوکا دیا۔ چنانچہ آپ نے صاف صاف فرمادیا:  
 ”تَفَرَّقُوا فِي سَوَادِكُمْ وَمَدَائِنِكُمْ فَإِنَّ الْقَوْمَ  
 يَطْلُبُونِي وَلَوْ أَصَابُونِي لَزَهَلُوا عَنِّي طَلَبِ  
 غَيْرِي“

یعنی ”تم اپنے اپنے شہروں اور دیہاتوں کو چلے جاؤ۔ یہ لوگ صرف  
 مجھے قابو میں لانا چاہتے ہیں اور اگر مجھے قابو میں کر لیں تو پھر انہیں  
 کسی اور سے کوئی غرض نہیں؛“

یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ ”اچھا بڑا جو راستہ بھی لوگ اختیار کریں سوچ  
 سمجھ کر اختیار کریں“

خلاصہ یہ کہ امام حسینؑ نے وہ کام کیا کہ ان کا لاشعہ تا ابد اسلام کی نشروائش  
 کا ذریعہ بن سکے اور آپ کی قبر اور آپ کا مزار ظلم و ستم کی ہر منظم کوشش کیلئے مستقل خطرہ بنا رہے۔  
 بنی امیہ اور بنی عباس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ لوگوں کو حضرت سید الشہداءؑ  
 کے روضے کی زیارت سے باز رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے روضے  
 کی اطراف میں چوکیاں اور قلعے قائم کیے اور مسلح فوجی معسکر رکھے۔ نگرانی  
 اتنی شدید تھی کہ کم ہی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی زائر بچکر نکل جائے۔ عموماً ایذا رسانی  
 اور قتل و تعذیب سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ خلفاء کی طرف سے دباؤ و قہر بڑھتا  
 جاتا تھا اتنی ہی لوگوں کی مزاحمت شدت اختیار کرتی جاتی تھی اور جتنا مزاحمت  
 میں اضافہ ہوتا تھا اتنی ہی انتظامیہ کی پریشانی بڑھتی تھی اور پہرہ چوکی کا انتظام  
 سخت تر کر دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں کتنے ہی ہاتھ کاٹے گئے، کتنے ہی سرتن سے  
 جدا کیے گئے اور کتنے ہی جہنموں کے ٹکڑے اڑا دیے گئے لیکن خلفاء کا مقصد پورا نہ ہوا۔

عباسی دور میں بار بار حسینؑ بن علیؑ کی قبر کو ویران کیا گیا، پانی چھوڑا گیا اور ہل چلا دیے گئے لیکن حکومت کی طرف سے ڈراسی ڈھیل کا احساس ہوتے ہی لوگوں نے مرمت کر لی یا نئی عمارت بنالی۔ روضہ مطہرہ کی تاریخ کے مطالعے سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ کب اور کس نے اس کی ویرانی کا حکم دیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے دوبارہ تعمیر کرایا اور کس نے مرمت اور تعمیر کے اخراجات برداشت کیے۔ اسی سے لوگوں کی جاں نثاری اور خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دربار حسینؑ کی زیارت سے لوگوں کو باز رکھنے کی اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ظالمانہ حکومتیں لوگوں میں زیارت کے شوق و جذبے اور تربت حسینؑ پر لوگوں کے اجتماع کو اپنی سیاست بلکہ اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتی تھیں۔

زائر حسینؑ محبوب جانتا ہے کہ حسینؑ شہید راہِ عدالت ہیں۔ انہوں نے ظلم و ستم کو رد کرنے کے لیے جان دی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے سر کٹوایا۔ انہوں نے مرنا منظور کیا مگر غاصبانہ حکومت کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے استبداد اور ظلم کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اسی لیے کوئی خلیفہ بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ حسینؑ بن علیؑ کی طرف اتنی توجہ ہو کہ لوگ ان کی زیارت اور عزاداری کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔

حکومت کے پرے چوکیوں کی سختی کے باوجود شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر لوگ روضہ حسینؑ پر پہنچتے تھے اور دن نکلنے سے پہلے غاصب یا نیکو اچلے جاتے تھے، جو کہ بلا کے قریب ہی واقع ہیں۔ مندرجہ ذیل واقعے سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

الو القریح اصفہانی نے اپنی کتاب مقاتل الطالبيين میں ایک شخص

محمد بن حسین اشمانی سے روایت کی ہے کہ میں خوف کے باعث مدت سے حسینؑ بن علیؑ کی زیارت سے محروم تھا۔ بالآخر میں نے کہا ہرچہ بادا باد، میں زیارت کے لیے ضرور جاؤں گا۔ میں اور ایک عطر فروش دونوں تیار ہو گئے اور زیارت کے لیے چلے۔ ہم دن میں چھپے رہتے اور رات بھر چلتے یہاں تک کہ غاضیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ وہاں سے رات کو نکل کر جب پہرہ دار سو رہے تھے، آہستہ آہستہ ابو عبد اللہ کی قبر مطہر تک پہنچے۔ ویرانی کی وجہ سے قبر کی صحیح نشاندہی نہیں ہو سکتی تھی۔ تلاش بسیار کے بعد قبر ملی۔ قبر کا تعویذ ایک طرف ٹوٹا ہوا اور آدھا جلا ہوا بڑا تھا اور قبر کے چاروں طرف پانی کھڑا تھا۔ کچھ حصے میں زمین نرم ہو کر دھنس گئی تھی اور گڑھوں نے خندق کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بارے قبر مطہر کی زیارت کی اور اس کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کیا۔ میں نے اپنے عطر فروش ساتھی سے پوچھا کہ یہ کونسی خوشبو ہے؟ اس نے کہا واللہ باللہ میں نے ایسی خوشبو اس سے پیشتر کبھی نہیں سونگھی تھی۔ آخر قبر سے رخصت ہوئے اور جگہ جگہ نشانیاں چھوڑ آئے۔ پھر جب متوکل قتل ہو گیا تو ہم اور آل ابی طالب کے کچھ افراد زیارت کے لیے گئے اور باہمی مدد سے دوبارہ پہلی سی قبر بنا دی۔

اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ زیارت امام حسینؑ کا کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ امام حسینؑ حتی و باطل کے فرق کا معیار سمجھے جاتے تھے اور جو حسینؑ کی مخالفت کرتا تھا، چاہے عزا داری اور زیارت سے روکنا ہی کیوں نہ ہو، اسے ظالم سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سید الشہداءؑ کے بعد ائمہ اہلبیتؑ نے قبر حسینؑ کی زیارت کی بڑی ترغیب دلائی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ اطہار زیارت سید الشہداءؑ کو اسلام کا ایک جزو و لاینفک

تصور کرتے تھے۔ سفر حج کے وجوب کے لیے تو جان کا خوف نہ ہونا ایک ضروری شرط ہے چنانچہ سب فقہاء نے بھی فتویٰ دیا ہے لیکن زیارتِ حسینؑ کے بارے میں ائمہ نے کہا ہے کہ جتنا زیادہ خوف ہو اور دشمن کی طرف سے جتنی زیادہ ممانعت ہو، زیارت کا اتنا ہی زیادہ ثواب ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ حج کی اس قدر عظمت کے باوجود جان کے خوف کی صورت میں حج تو نہ کیا جائے اور زیارت کر بلا کی اس وقت بھی تاکید ہو جب تو نے فیصد مارے جانے کا اندیشہ ہو۔ اس لیے یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ائمہ اطہارؑ ایسے موقعوں پر حج بیت اللہ کی بقاء زیارتِ حسینؑ بن علیؑ سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس کے سوا ان روایات کا کوئی محل نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر اکرمؐ سے مشہور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

”حُسَيْنٌ وَبِيٍّ وَأَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ“

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں“

اس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ حسینؑ میرے جسم کا ٹکڑا ہے کیونکہ ہر بچہ اپنے نانا دادا کا جگر گوشہ تو ہوتا ہی ہے۔ فرض کیجیے کہ اس جملے کے پہلے حصے کے یہی عام معنی مراد لیں تو پھر دوسرے حصے کا یعنی ”أَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ“ ”میں حسینؑ سے ہوں“ کا کیا مطلب ہو گا؟ اس لیے اس حدیث کے صحیح معنی یہی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حسینؑ کا وجود مجھ سے ہے اور میرے نبی کی بقاء حسینؑ سے ہے۔

سید الشہداء کی شہادت کے بعد علویوں نے بنی امیہ اور بنی عباس کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑیں ان میں سے بیشتر میں علویوں کا نعرہ ”یا لثاراتِ الحسین“۔ ”خونِ حسینؑ کا بدلہ“ ہی تھا۔ علوی اکثر قبرِ مطہر پر جمع ہو کر ایک دوسرے سے بیعت لیتے تھے۔ اسی وجہ سے خلفاءِ امامؑ کے مرقدِ مطہر سے خائف رہتے تھے اور ان کے ظلم و ستم کے ایوانوں میں زلزلہ برپا رہتا تھا۔ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر زیارت پر پابندی لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ بنی امیہ شہادتِ امامؑ کے بعد ستر سال تک برسرِ اقتدار رہے۔ اس پورے عرصے میں ان کے عمال اور عہدیدار زیارت کی مزاحمت کرتے رہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اموی انتظامیہ نے حسینؑ کو قتل کیا تھا اس لیے زیارتِ حسینؑ امویوں کے لیے رسوائی اور شرم کا موجب تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن بنی عباس تو خود مجرم نہیں تھے۔ وہ زیارتِ حسینؑ بن علیؑ کے اس قدر مخالف کیوں تھے؟ زیادہ سخی تو بنی عباس ہی نے کی۔ اس سلسلے میں لوگوں کے ہاتھ کاٹے اور سر ارٹائے۔ بنی امیہ کو تو ستر سال میں بھی ایسی جرأت نہیں ہوئی لیکن بنی عباس نے قبرِ مطہر کو دیران کرنے، وہاں پانی چھوڑنے اور ہل چلوانے میں کوئی کمی نہیں کی، یہ سب کیوں؟ اسی لیے تاکہ وہ لاشہٴ حسینؑ سے بھی خوفزدہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ شہدائے عاشورا کی تربت سے باہوش زائرین کے کانوں میں صاف یہ صدا آتی ہے کہ:

”اے گزرنے والے! ہمارے ہم کیشوں تک یہ پیغام پہنچا دو کہ ہمارے اس لیے گمٹے کر دیے گئے کہ ہم نے جفا پیشہ حکومت کا مقابلہ کیا۔ ہمیں ظالم انتظامیہ نے خون میں نہلایا، ہم نے حاکمانِ وقت کو ان کی

بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کی تو انھوں نے ہمیں ذبح کر دیا۔ ہم نے اسلامی آئین کی بات کی تو ہمارے پرہیزگاروں نے اڑا دیے گئے۔ ہمارے جسموں کو گھوڑوں کے سمنوں تلے روندنا گیا لیکن ہم مزاحمت کرتے رہے۔ ہم نے کینیڈا پر دشمن کو دنیا سے انسانیت میں رکھا کر دیا اور اسلامی قانون کی حفاظت کے لیے جاں نثاری اور ذرا کاری کا ایک نیا باب بنیادوں کے لیے کھول دیا۔ اے آنے والو! اب تم اپنے دین کی قدر پہنچاؤ اور اسے کوڑیوں کے مول نہ بیچو۔ اس کی حفاظت اور حمایت کے لیے ہم جیسے لاکھوں انسانوں کا خون بہا ہے۔ خون شہداء کا احترام کرو۔ اپنے دین کی عظمت کو سمجھو اور دین داری میں غفلت نہ کرو۔ زیارت کا مطلب یہی ہے کہ نذر تیرہ سمجھے کہ وہ کس کی زیارت کر رہا ہے؟ اس کا مقام کیا ہے، اس کا پیغام کیا ہے اور وہ کیوں اس مرتبے پر پہنچا ہے؟“

علی اکبر غفاری



”جو شخص اپنے آپ کو سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا سچا اور مخلص پیرو سمجھتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شجاع، غیور اور فداکار ہونہ کہ بُزدل اور کاہل۔ اسے چاہیے کہ مسلمانوں کے حالات کی اصلاح اور دین کی سربلندی کی خاطر رضا کارانہ طور پر مال و دولت اور رتبہ و منصب غرضیکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے اور وہ جو کچھ بھی رکھتا ہو اسے اس عظیم مقصد کی خاطر ٹھکرا دے“

آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی  
کی کتاب بیان سے ماخوذ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ بِاَرِیْضِ الْخَلَاِیْقِ  
 اَجْمَعِیْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ  
 اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهِ الطَّاهِرِیْنَ ۔

اب ہم سید الشہداء امام حسینؑ کی شریک پر جو اسلامی تاریخ کا ایک  
 درخشندہ ترین باب ہے، ایک نظر ڈالتے ہیں اور ایک سال سے بھی کم مدت  
 میں جو واقعات پیش آئے انہیں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعات کبیت  
 کے لحاظ سے مختصر سہی لیکن کیفیت کے لحاظ سے زوال ناپذیر اور بہت پراثر ہیں۔  
 اسلامی اور غیر اسلامی تاریخ کے ہر باب میں ایسی شریف ہوتی رہی ہے اور  
 ہو رہی ہے جس سے تاریخی واقعات کی شکل ہی بدل جاتی ہے اور آنسے ولے  
 محققین کے لیے تحقیق کا کام بہت دشوار ہو جاتا ہے کبھی یہ تحریف نادان طرفداروں  
 کی طرف سے ہوتی ہے اور کبھی کبیت پر ورغنا فنوں کی طرف سے۔ تاریخ کا کون سا

صفحوں پہ جو ایسی دستبرد سے بچا ہوا درخیانت کار ہاتھوں نے اس کا چہرہ مسخ نہ کر دیا ہو۔

صرف امام حسینؑ کی تحریک کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ کسی بدباطن دشمن کو اس میں تحریف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ تحریک اس قدر واضح، روشن اور ناقابل تنقید رہی ہے کہ آپ کے والد علیؑ اور آپ کے بھائی حسنؑ کے دشمنوں کو بھی اس کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑا اور دل و جان سے تحسین و آفرین کرنی پڑی۔ جن حالات میں اس تحریک کا آغاز ہوا اور اس وقت کی اسلامی حکومت کی جو حالت تھی اس نے اس تحریک کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد دی ہے چنانچہ جس نے بھی اس تحریک پر قلم اٹھایا ہے اس نے اس کے رہنماؤں کی عظمت، بزرگی، شجاعت، صفا گوئی، مردانگی، حریت پسندی اور آزاد منشی کا اعتراف کیا ہے لیکن سخت افسوس کی بات ہے کہ جاہل طرفداروں اور ضرورت سے زیادہ پر جوش دوستوں کی طرف سے بہت سی بے بنیاد باتیں، بے سرو پا قصے، گمراہ کن جھوٹ بھی اس تحریک سے متعلق تحریریں اور تقریریں ہیں شامل ہو گئے ہیں۔ کربلا کی تاریخ کو ہر قسم کے جھوٹ، افسانہ طرائیوں اور بے اساس باتوں سے پاک اور منظر رکھنا سالار شہیداں کی بارگاہ مقدس کی ایک بڑی خدمت ہے لیکن اس کام کی انجام آوری کی توقع عوام اور کم سواد لوگوں سے نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ مصیبت خود انہی لوگوں کی لائی ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ اس انقلاب مقدس کے خلاف کام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق کو باطل کے ذریعے اور سچ کو جھوٹ کے ذریعے پھیلایا جاسکتا ہے، امانت کو خیانت کے ذریعے اور تقویٰ کو بے تقوائی سے رواج دیا جاسکتا ہے۔ امام حسینؑ کی تحریک کو کم زور روایتوں اور لغو اور بے اصل باتوں سے الگ

رکھنا اور جو کچھ تیسری، چوتھی صدی ہجری کے مصنفین نے لکھا ہے اسی پر اکتفا کرنا صرف صاحب بصیرت اور بالفقہی عاملوں کا کام ہے اور یہ ان کا فرض ہے کہ اپنی زبان اور اپنے قلم سے سچ بولیں اور اپنی تحریر و تقریر میں جھوٹ اور افسانہ طرازی سے پرہیز کریں۔ اگر ایسا ہو تو تاریخ اسلامی کے اس روشن اور مقدس باب کی بنیاد سچی و راستی اور تحریر و تقریر کی امانت پر قائم ہوگی۔ اسلامی تاریخ کے اس عظیم ترین واقعہ کی قدر و قیمت اور اس کے رہبر عالی وقار کی عظمت پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہوگی اور ہماری مجالس عزائمیں بھی عظمت، وقار، خلوص، جلال، شہادت، جہاد، استقامت اور حواغری کے آثار جلوہ گر ہوں گے۔

### امیر شام کا نفوذ

پینچم اسلام حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے تقریباً پچاس سال، حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت سے بیس سال اور امام حسنؑ کی شہادت سے دس سال بعد وسط ماہ رجب سنہ ۶۵ھ میں معاویہ بن ابی سفیان نے اس دنیا سے کوچ کیا معاویہ نے کم و بیش ۴۲ برس

۱۔ یہ لقب شیعوں میں فقط حضرت علیؑ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دمشق میں امارت و خلافت کی۔ پانچ سال کے قریب خلیفہ دوم کی طرف سے اور تقریباً بارہ سال خلیفہ سوم کی طرف سے امیر شام رہے۔ پانچ سال سے کچھ کم امیر المؤمنینؑ کے دورِ خلافت میں اور چھ ماہ کے قریب امام حسنؑ کی خلافت کے دوران میں بھی شام پر معاویہ کا قبضہ رہا اور علیؑ اور حسنؑ بن علیؑ سے آویزش جاری رہی۔ بیس سال سے کچھ کم خلافتِ اسلامی معاویہ کے قبضے میں رہی اور اپنی عمر کے اواخر میں انھوں نے اپنے بیٹے یزید کے لیے مسلمانوں سے خلافت کی بیعت لی۔ معاویہ خاندان بنی امیہ کے پہلے خلیفہ تھے۔ اس خاندان میں کل چودہ سفیانی اور مروانی خلفاء ہوئے جن کے ہاتھ میں ایک ہزار چھٹے تک اسلامی حکومت کی باگ ڈور رہی۔

معاویہ کو اپنے زمانہِ خلافت میں حالات پر ایسا مکمل قابو حاصل تھا کہ وہ اس صلحنامے کی جو انہوں نے امام حسنؑ سے کیا تھا صریح خلاف ورزی پر بھی قادر تھے۔ مثلاً اس صلحنامے میں ایک شرط یہ تھی کہ شیعین علیؑ کو ستایا نہیں جائے گا، انہیں قتل نہیں کیا جائے گا اور سب کو امان ملے گی۔ اس صلحنامے میں حجر بن عدی کا نام خاص طور پر درج تھا مگر اس بات پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ معاویہ نے حجر بن عدی اور ان کے چھ ساتھیوں کو مروادیا۔ ان میں سے ایک کو تو زیاد بن ابیہ نے عراق میں زندہ درگور کر دیا۔ ان صاحب کا نام عبدالرحمن بن حنان غزالی تھا۔ معاویہ کو ایسا اقتدار حاصل تھا کہ وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے اور کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں تھی۔

چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے مورخ اور جغرافیہ دان علی بن حسین سعودی نے اپنی کتاب مروج الذهب میں لکھا ہے کہ صفین سے واپسی میں ایک شخص

اونٹ پر سوار دمشق میں آیا۔ ایک شامی اس سے الجھڑا کہ یہ اونٹنی تو میری ہے۔ جنگِ صفین کے دوران لوٹ میں چلی گئی تھی، تیرے ہاتھ لگ گئی۔ ان کا جھگڑا طول بکڑ گیا اور اوپر تک جا پہنچا۔ دونوں معاویہ کے پاس پہنچے۔ شامی نے پچاس گواہ پیش کیے کہ اونٹنی اس کی ہے۔ معاویہ نے پچاس آدمیوں کی شہادت پر فیصلہ دیدیا کہ اونٹنی شامی کی ہے اور کوئی کو مجبور کیا کہ اس کے حوالے کر دے، بلقی نے کہا کہ اللہ آپ کو نیکی دے، یہ اونٹ ہے اونٹنی نہیں۔ معاویہ نے کہا: میں نے فیصلہ دیدیا ہے اب میرا حکم بدل نہیں سکتا۔

جب بھیڑ چھٹ گئی تو معاویہ نے کوئی کو بلایا اور پوچھا کہ تیرا اونٹ کتنے کا تھا؟ اور اونٹ کی قیمت سے زیادہ رقم اس کو دلوادی اور اس سے کہا کہ علیؑ کو جا کر بتلا دینا کہ میرے پاس ان سے جنگ کے لیے ایک لاکھ آدمی ایسے ہیں جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے، مطلب یہ تھا کہ اگر میں اونٹ کو اونٹنی یا اونٹنی کو اونٹ کہوں تو بھی چون و چرا نہیں کرتے۔

یہ داستان بیان کرنے کے بعد مسعودی لکھتا ہے کہ لوگ معاویہ کی اس قدر اطاعت کرتے تھے کہ اس نے جنگِ صفین کے لیے روانگی کے موقع پر بدھ کے دن نماز جمعہ کی اذان دلوادی اور لوگوں کے ساتھ مل کر نماز جمعہ پڑھی اور کسی نے نہ کہا کہ آج بدھ ہے، نماز جمعہ کیوں ادا کی جا رہی ہے۔

مسعودی نے ایک اور قصہ لکھا ہے جسے ہم ”الفضائح الکافیہ لمن تیولی معاویہ“ نامی کتاب سے نقل کرتے ہیں:

عمار بن یاسرؓ جنگِ صفین میں معاویہ کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ رسول اللہؐ نے (حسب روایت بخاری و بیہق) مسجد کی تعمیر کے موقع پر دوسروں سے

زیادہ کام کرتے دیکھ کر کہا:

”عَمَّارٌ!! تَقْتُلُهُ الْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ، يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ  
وَيَدْعُوهُمْ إِلَى النَّارِ“.

عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کریگا۔ عمارؓ ان لوگوں کو جنت کی طرف  
بلادہا ہوگا اور وہ لوگ اسے دوزخ کی طرف بلا رہے ہونگے۔

عمارؓ کے قتل نے واضح کر دیا کہ کون حق کی راہ میں لڑا ہے اور کون طاغوت  
کی راہ میں۔ معاویہ نے اسی مشکل سے بچنے کے لیے کہا کہ عمارؓ کو ہم نے قتل نہیں کیا۔  
اس کے قاتل علیؓ ہیں جو انہیں جنگ میں گھسیٹ لائے۔ جب علیؓ سے معاویہ کا  
یہ قول نقل کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ اس طرح تو سید الشہداءؓ کے قاتل جناب  
رسول اللہؐ ٹھرتے ہیں جو انہیں مشرکین سے جنگ کے لیے لے گئے تھے۔

معاویہ کو تو اطمینان تھا کہ وہ کیسی ہی غیر معقول بات کہیں لوگ مان لیں گے  
اس لیے انہوں نے یہ سن کر کہا، ٹھیک ہے عمارؓ کے قاتل ہم ہی ہیں لیکن رسول اللہؐ  
کے کلام میں ”فِتْنَةٌ بَاغِيَّةٌ“ کا لفظ ہے۔ باغیہ کے معنی ظالم نہیں طالب  
ہیں۔ ہم دم عثمان کے طالب ہیں۔ قصاص چاہتے ہیں۔ پس رسول اللہؐ نے جو فرمایا  
اس کے معنی ہیں کہ عمارؓ کو وہ گروہ قتل کرے گا جو دم عثمان کے مطالبے کے لیے  
نکلے گا اور اس میں کوئی بری بات نہیں۔

یہ بھی لغو بات تھی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ عمارؓ کو وہ گروہ قتل کرے گا جو  
انہیں دوزخ کی طرف بلا رہا ہوگا اور عمارؓ اسے جنت کی طرف بلا رہے ہونگے۔  
لیکن معاویہ کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کے پیروکاروں کو کسی  
دلیل اور حجت سے قائل نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا مقصد معاویہ کی حکومت کی تاریخ

بیان کرنا نہیں، صرف قارئین کو اس زمانے کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اگر کوئی اس حکومت کے مزید حالات کا مطالعہ کرنا چاہے تو یہی کتاب ”المنصاح الکافیہ لمن یتولی معاویہ“ دیکھے اور اول سے آخر تک پڑھے اور پھر انصاف کرے۔

## یزید کی خلافت

جب یزید مستدر خلافت پر بیٹھا تو ولید بن عقبہ بن ابی سفیان امیر مدینہ تھا۔ عمرو بن سعید بن عاص امیر مکہ تھا۔ نعمان بن بشیر امیر کوفہ اور عبید اللہ بن زیاد امیر بصرہ تھا۔

یزید نے سب سے پہلے یہ طے کیا کہ حسین بن علیؑ، عبداللہ بن زبیرؑ اور عبداللہ بن عمرؑ سے جنھوں نے اس کی ولی عہدی تسلیم نہیں کی تھی بیعت لی جائے چنانچہ مدینہ کے حاکم ولید بن عقبہ کو لکھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ان تینوں سے بیعت لی جائے۔ ولید نے اس مقصد کے لیے مروان بن حکم کو بلایا اور اس سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ ولید اور مروان کے درمیان اگرچہ ناچاقی تھی لیکن اس موقع پر ولید نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔ مروان نے کہا بھی ان تینوں کو بلاؤ، اگر بیعت منظور کریں تو بہتر ورنہ اس سے پیشتر کہ انھیں معاویہ کی موت کی اطلاع ملے، قتل کر دو ورنہ اگر انہیں یہ خبر مل گئی تو ہر ایک خلافت کا دعویدار بن جائے گا۔ ہاں عبداللہ بن عمر کی طرف سے زیادہ فکر کریں کی ضرورت نہیں۔ وہ لڑنے بھڑنے والے آدمی نہیں۔

ولید نے عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیر کے پاس بھیجا۔ وہ دونوں مسجد میں تھے۔ عبداللہ نے ولید کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے



کہا۔ تم جلو، ہم ابھی آتے ہیں۔ امامؑ نے عبداللہ بن زبیر سے کہا معلوم ہوا ہے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ بے وقت کا بلا وایزید کی بیعت کے لیے ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے جو انان بنی ہاشم (اپنے آدمیوں) کو بلایا اور کہا کہ مسلح ہو جاؤ۔ مجھے اس وقت ولید نے بلایا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے گا جو میں نہیں کر سکوں گا۔ اس صورت میں مجھے اس پر بھروسہ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔ جب میں دروازے میں داخل ہو جاؤں تو تم باہر ٹھہرے رہنا اور جب میں اندر سے پکاروں تو فوراً اندر چلے آنا تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

امامؑ ولید کے پاس گئے۔ مروان بھی وہاں موجود تھا۔ ولید نے معاویہ کی موت کی اطلاع دی اور یزید کی بیعت کا حکم سنایا۔ امامؑ نے کہا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ خفیہ بیعت سے تو تم مطمئن نہیں ہو گے۔ یہی چاہو گے کہ میں مجمع عام میں بیعت کر دوں۔ ولید نے کہا۔ ہاں یہ تو صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا تو پھر کل تک ٹھہرو، میں نصیلا کر دوں۔ ولید نے کہا، اچھا آج تشریف لے جاتے، کل مجمع کے ساتھ آئیے اور بیعت کر لیجیے۔ مروان بولا: اگر آج تم نے حسین بن علیؑ کو بیعت کیے بغیر جانے دیا تو پھر یہ قابو میں نہیں آئیں گے۔ بڑی خونریزی ہوگی، انہیں بیعت کیے بغیر نہ جانے دو اور اگر نہ مانیں تو گردن مار دو۔

مروان کی بات سنتے ہی امامؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا: اے وحی ابن دہیٰ تو مجھے مارے گا یا کہ ولید ہتھم خدا کی تو جھوٹا ہے۔ یہ کہہ کر امامؑ نے اپنی راہ لی اور اپنے آدمیوں کو ساتھ لیکر گھر چلے آئے۔ مروان نے ولید سے کہا، تم نے میری بات نہ سنی۔ بخدا! اب کی کبھی تمہارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ولید نے کہا، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے میرا دین برباد کرنے والی تجویز پیش کی تھی۔ بخدا اگر ساری دنیا کا مال و متاع بھی میرے

قدیموں میں ڈال دیا جائے تو بھی میں حسین بن علیؑ کو قتل کرنا پسند نہیں کروں گا۔ اگر حسین بن علیؑ یرزید کی بیعت سے انکار کریں تو میں انہیں مار ڈالوں؟ سبحان اللہ! میرا تو خیال ہے کہ جس کی گردن پر حسین بن علیؑ کا خون ہو گا وہ روز قیامت بڑا ہی بد نصیب ہو گا۔

مردان کو ولید کی گفتگو پسند نہیں آئی۔ اس نے کہا: اگر تمہارا ایسا خیال ہے تو پھر ٹھیک ہے۔

انگلے روز ۲۸ رجب ۶۱ھ کو ہفتہ کا دن تھا، ولید نے پھر امامؑ کو بیعت کے لیے بلایا۔ انہوں نے جواب میں کہا: بھیجا کہ آج اور پھر وہ کل فیصلہ کروں گا اور اسی رات ۲۹ رجب ۶۱ھ کو اپنی ازواج، بھائیوں، بھتیجوں اور بیشتر افراد خالوادہ کے ساتھ مدینہ سے چلے گئے اور حضرت موسیٰ بن عمران کے الفاظ میں ”قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ“ کہتے ہوئے مکہ کا راستہ لیا۔ جب امامؑ سے کہا گیا کہ کاش آپ بھی ابن زبیر کی طرح کسی غیر معروف راستے سے جاتے تاکہ کسی کو آپ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ مل سکتا تو آپ نے فرمایا: بخدا میں غیر معروف راستے سے نہیں جاؤں گا، جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔ غرض ۳ شعبان جمعہ کی شب آپ مکہ پہنچے اور حضرت موسیٰؑ کے قصے کو یاد کر کے کہا:

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تَلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَنُ

يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ○

مکہ میں حجاج امامؑ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ابن زبیر بھی ہر روز حاضر خدمت ہوتے۔ انہیں معلوم تھا کہ قرظندہ غیر مکہ کے ہوتے ہوئے کوئی ان سے بیعت نہیں کرے گا۔ امامؑ کا مرتبہ ہر لحاظ سے ان سے بلند ہے۔

معاویہ کے مرنے کی خبر سارے عراق میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں کو معلوم  
 تھا کہ حسینؑ بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیرؑ یزید کی بیعت سے انکار کر کے مکہ چلے  
 گئے ہیں۔

شیعہ بزرگان سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے۔ معاویہ کی موت  
 پر خدا کا شکر ادا کیا۔ سلیمان بن صرد نے کہا کہ معاویہ تو دنیا سے جلا چکے اور حسینؑ بن علیؑ  
 بھی یزید کی بیعت سے انکار کر کے مکہ روانہ ہو گئے۔ اب تم لوگ جو ان کے اور  
 امامؑ کے والد کے شیعہ ہو، اگر امامؑ کی مدد کرنے اور ان کے دشمنوں سے لڑنے کے  
 لیے تیار ہو اور ان کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو تو انہیں خط کے ذریعے اطلاع دیو  
 اور اگر ڈرتے ہو کہ ان کی مدد نہیں کر سکو گے تو انہیں دھوکا مت دو اور بلا وجران  
 کی جاں نثاری کا دم مت بھرو۔ سلیمان بن صرد کو معلوم تھا کہ جب تک قسریانی اور  
 جاں نثاری کا موقع نہیں آتا، لوگ حق و باطل کی تمیز میں غلطی نہیں کرتے اور خوب  
 سمجھتے ہیں کہ راستگو کون ہے اور دروغ گو کون! رہبر کون ہے اور ہزن کون! لیکن ضرر  
 اسی وقت تک جب تک انکے اپنے نفع و نقصان کا معاملہ بیچ میں نہ آئے اور اہل حق  
 کی اعانت اور اہل باطل سے جنگ میں خود انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو،  
 لیکن جب آزمائش کی گھڑی آتی ہے اور حق و باطل سامنے آکھڑے ہوتے ہیں تو  
 زیادہ تر لوگ باطل کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور چونکہ حق کی اعانت بغیر قربانی اور  
 فداکاری کے نہیں ہو سکتی اس لیے لوگوں کی رائے بدل جاتی ہے اور وہ حق کو چھوڑ  
 کر باطل کے طرفدار بن جاتے ہیں۔ سلیمان بن صرد خوب جانتے تھے کہ اس پر بھروسہ  
 نہیں کیا جاسکتا کہ آج لوگوں کے احساسات کیا ہیں۔ کل جب حسینؑ بن علیؑ بنی امیہ  
 سے مقابلے کے لیے کھڑے ہوں گے اور بنی امیہ کی پوری طاقت ان کے قتل کے

درپے ہوگی، اس وقت ان کی اعانت دشوار ہو جائے گی تو یہی لوگ ان سے منہ پھیر لیں گے۔ اپنے خطوط فراموش کر دیں گے، اپنے گھروں کے دروازے بند کرینگے بلکہ ان کے مخالفوں اور دشمنوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے، ان کے قتل کو واجب شرعی سمجھتے ہوئے خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کی خاطر انھیں موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی نہیں ہچکچایں گے اور ان کے قتل کے بعد بیدار لوگ رو بہ قبلہ ہو کر نعرہ لگائیں گے:

”اللَّهُ أَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“

جیسے کہ انہوں نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ سلیمان نے شیعہ بزرگان پر تمام حجت کیا اور کہا کہ انجام پر اچھی طرح نظر کر لو اور جو حالات پیش آئیں گے انہیں سوچ لو کہ واقعی پورے اطمینان قلب کے بعد امامؑ کو اپنی مدد کا یقین دلا کر عراق بلا رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آج نوجوش میں آکر خط لکھ دو، عہد و پیمانہ کرو، قسمیں کھاؤ اور کل جب فرزند رسولؐ حرم خدا سے سرزمین عراقی پہنچیں اور سن انہیں گھیرے میں لیکر بیعت کے لیے دباؤ ڈالے اور موت کی دھمکی دے تو تم ان کی نصرت سے ہاتھ اٹھا لو اور اپنے عہد و پیمانہ کو بھول جاؤ۔

شیعہ اکابرین نے بیک آواز کہا کہ: ہم جہاد اور جاں نثاری کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ ہم اپنے امام کے لیے جان دیدیں گے۔

سلیمان نے کہا: اگر یہ بات ہے تو فوراً امامؑ کی خدمت میں خط لکھو، چنانچہ اس مضمون کا خط لکھا گیا:

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”یہ خط ہے سلیمان بن عمرو، مسیب بن نجبه، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب بن مظاہر اور دوسرے مسلمانانِ بایمان، ساکنانِ کوفہ، شیعیانِ حسین بن علیؑ کی طرف سے حسین بن علیؑ کی خدمت میں۔ آپ پر سلام۔ ہم خدائے وحدہ لا شریک کی حمد میں آپ کے ہم زبان ہیں۔ حمد اس خدا کی جس نے آپ کے دشمن کو فنا کر دیا۔ وہی جس نے اس امت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور زبردستی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس نے بیت المال کو غصب کیا اور مسلمانوں کی رضا مندی کے بغیر ان پر حکومت کی اور پھر نیک لوگوں کو قتل کیا اور بدکاروں کو چھوڑ دیا۔ خدا کا بال ظالموں اور دولتمندوں کے حوالے کر دیا۔ خدا سے اپنی رحمت سے دور رکھے، جیسا کہ قوم ثمود کو رکھا۔

اب ہم عراقیوں کا کوئی پیشوا اور امام نہیں ہے لہذا آپ ہماری طرف روانہ ہو جائیے۔ شاید خدائے ذوالجلال آپ کے وسیلے سے ہمیں حق پر اکٹھا کرے۔ ہم جمعہ و جماعت میں نعمان بن بشیر سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ وہ دارالامارہ میں تنہا ہے۔ اگر ہمیں اطلاع ملے کہ آپ ہماری طرف آنے کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم اسے نکال باہر کریں اور انشاء اللہ شام تک اسکا پیچھا کریں۔ یہ خط اٹھوں نے عبداللہ بن سلیم ہمدانی اور عبداللہ بن والی کو دیا اور ان سے کہا کہ فوراً مکہ روانہ ہو جائیں۔ وہ دونوں ۱۰ رمضان ۳۱ھ کو مکہ میں امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خط انہیں پیش کر دیا۔

## امامؑ کے نام اہل کوفہ کے خطوط

دو روز بعد کوفہ سے تقریباً ڈیڑھ سو اور خطوط بھیجے گئے۔ ہر خط ایک یا دو چار آدمیوں کی طرف سے تھا۔ ان میں سے اکثر خط قیس بن مسہر صیداوی، عبد الرحمن بن شداد رحمی اور عمارہ بن عبد اللہ سلولی مکہ لیکر آئے اور دو روز بعد شیعیاں کوفہ نے ہانی بن ہانی سبعی اور سعید بن عبد اللہ حنفی کے ہاتھ اس مضمون کا خط بھیجا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ خط حسینؑ بن علیؑ کے نام ہے۔ شیعیاں باایمان کی طرف سے جلدی کیجئے! لوگ آپ کے انتظار میں ہیں۔ آپ کے سوا کسی کی جانب نگاہ نہیں ہے۔ جلدی کیجئے! بہت بہت جلدی! والسلام۔

اس کے بعد شہت بن ربیع، حجار بن ابجر، یزید بن حارث بن رویم عمرو بن قیس، عمرو بن حجاج زبیدی اور محمد بن عمرو تمیمی نے اس مضمون کا خط لکھا:

”باغ و بیابان سرسبز و شاداب ہیں۔ میوے پک گئے ہیں۔ جب چاہیں روانہ ہو جائیں۔ آپ کے عراقی سپاہی آپ کے خیر مقدم کے لیے تیار ہیں! السلام“

اہل کوفہ کے خطوط کا امامؑ کے پاس ڈھیر لگ گیا اور عراقی ایلچی مکہ میں جمع ہو گئے تو امام نے کوفیوں کے خطوط کے جواب میں لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اے حسینؑ بن علیؑ، ہومنان و مسلمانانِ عراق۔ تمہارے تازہ ترین ایلچی ہانی اور سعید تمہارے خط لائے۔ میں نے تمہاری تحریریں پڑھیں اور ان پر غور کیا۔ تم نے لکھا ہے کہ ہمارا کوئی امام (رہبر) نہیں اس لیے آپ ہماری طرف روانہ

ہو جائیے شاید آپ کے وسیلے سے خدائے ذوالجلال ہمیں حق اور ہدایت پر جمع کرے۔  
میں اپنے عم زاد بھائی اور معتمد مسلم بن عقیل کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اگر انہوں  
نے جو اباً مجھے لکھا کہ تمہارے اشراف اور بزرگ بھی وہی کہتے ہیں جو تمہارے ایلچی  
کہتے ہیں اور جو تم نے اپنے خطوں میں لکھا ہے تو میں جلد ہی روانہ ہو کر تمہارے  
پاس پہنچ جاؤں گا۔ امام تو وہی ہے جو قرآن حکیم کے مطابق حکم کرے، میزان  
عدل قائم کرے، دین حق کا اجرا کرے اور اپنے آپ کو راہِ خدا میں وقف  
کر دے۔ والسلام۔

امامؑ نے یہ خط ہانی اور سعید کے ہاتھ بھیج دیا۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل سے  
فرمایا کہ قیس بن مسهر صیداوی، عمارہ بن محمد اللہ سلولی اور عبد الرحمن بن عبد اللہ  
ارجمی کے ہمراہ عراق روانہ ہو جائیں۔ آپ نے انھیں نصیحت کی کہ تقویٰ کا راستہ  
اختیار کریں، اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کریں اور سب کے ساتھ خلق اور نرمی کا  
برتاؤ کریں۔ اگر دیکھیں کہ لوگ تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں تو فوراً اطلاع دیں۔

### مسلم بن عقیل کی کوفہ روانگی

جناب مسلم براہِ مدینہ کوفہ گئے اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے یہاں قیام  
کیا۔ شیعوں کی ان کے پاس آمد و رفت شروع ہو گئی۔ یہ لوگ اس خیال میں تھے کہ  
کام یا سانی ہو جائے گا۔ حسینؑ بن علیؑ یرید کے مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے  
اور عدل و تقویٰ ظلم و گناہ کی جگہ لے لیں گے۔ دراصل یہ لوگ معاویہ کی بیانیس  
سالہ حکومت کا سبق بھول چکے تھے۔ جب امامؑ کا خط انھیں پڑھ کر سنایا جاتا  
تو فرط شوق سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ خلوص دل سے امامؑ

کے مناسب خاص کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ شیخ مفید نے لکھا ہے کہ اس طرح ستر ہزار اور بقول طبری بارہ ہزار لوگوں نے ان سے بیعت کی۔ دوسری طرف یزید کو بھی خبر مل گئی کہ مسلم کو فہ پہنچ گئے ہیں اور وہاں شیعوں نے ان سے بیعت کر لی ہے اور نعمان بن بشیر نے ان کو روکنے میں کمزوری دکھائی ہے۔ یزید نے فوراً عبید اللہ بن زیاد کو جو بصرہ کا حاکم تھا، عراق میں یعنی کو فہ اور بصرہ دونوں جگہ کی حکومت سونپ دی اور اسے لکھا کہ فوراً کو فہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو گرفتار یا قتل کر دو یا کم از کم وہاں سے نکال دو۔ عبید اللہ حکم ملتے ہی کو فہ روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن تقریر کی اور کہا: یوں تو یزید بہت مہربان ہے لیکن مخالفت بالکل برداشت نہیں کرنا۔ اس کے بعد قبائل کے سرداروں اور برادروں کے چوہدریوں کو بلایا اور ان کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ طرفدارانِ حق کی تعداد کم ہونے اور پیرانِ باطل کی تعداد بڑھنے لگی۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ:

”کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم ایمان لے آئے آزمائش سے

بچ جائیں گے۔ ہم نے ان سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے تاکہ

یہ معلوم ہو کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟“ (سورہ عنکبوت، آیات ۳۰-۳۱)

سچے وہ ہیں جو آزمائش کے وقت اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور کسی خوف یا لالچ کی وجہ سے راہِ حق سے نہیں پھرتے اور جھوٹے وہ ہیں جو آزمائش سے پہلے تو خوب بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے ہیں اور اپنے آپ کو حق کا طرفدار اور باطل کا دشمن ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم حق کا ساتھ دیں گے اور حق کے دفاع کے لیے جان کی بازی لگانے سے



بھی دریغ نہیں کریں گے اور باطل کے وعدے انہیں ان کے راستے سے ٹھنکا نہیں سکیں گے اور دنیا کا مسحور کن جلوہ ان کے دل کو بھانپیں سکے گا لیکن جیسے ہی حالات بدلتے ہیں اور ایک طرف ثابت قدمی اور استقامت کے راستے میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دوسری جانب باطل کا چہرہ اپنے وعدوں اور امیدوں کے ساتھ آتا ہے۔ ادھر جہاد، قربانی اور جانبازی ہوتی ہے اور ادھر نعمت، قدرت، زندگی، لذت اور شہوت ہوتی ہے تو ان حالات میں ان کی ذہنی کیفیت بدل جاتی ہے۔ دلیری کی جگہ بزدلی اور کم ہمتی، ایمان کی جگہ شک اور بے یقینی اور اخلاص کی جگہ شرک اور نفاق کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ جھوٹے صرف وہی نہیں جو امتحان سے پہلے بھی سچی کی طرح قہاری اور باطل کی مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی جھوٹے ہیں جن کی حالت خدائی امتحان کے وقت بدل جاتی ہے اور کل جسے سچی سمجھتے تھے آج اسے باطل کہنے لگتے ہیں۔

اہلِ کوفہ جو مرگ معاویہ کی خبر ملتے ہی سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے تھے اور جنہوں نے تقریریں کی تھیں اور حالاتِ حاضرہ پر غور کرنے کے بعد خط لکھا تھا اور اسی طرح وہ لوگ جو مسلم کے کوفہ پہنچنے پر ان کے پاس آمد و رفت کرتے تھے اور جنہوں نے ان کے ہاتھ پر نائبِ امام کی حیثیت سے بیعت کی تھی، وہ سب امام کو دھوکا دینا نہیں چاہتے تھے اور نہ امام کی شہادت اور ان کے خاندان کی گرفتاری کے روادار تھے۔ ان کی نیت نیک تھی۔ وہ بیزید حبیبیہ شخص کی خلافت کو اور وہ بھی رسولِ خدا کی وفات سے صرف پچاس سال بعد شرمناک سمجھتے تھے۔ وہ کسی دوسرے مسلمان کو فرزندِ رسولِ خدا حسینؑ بن علیؑ پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے ہر موقع پر امام حسینؑ کی

تائید کی ہے، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور اس سلسلے میں ہر شکل اور ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کریں گے لیکن یہی لوگ جھوٹے اور وعدہ خلاف نکلے۔ اپنے پہلے خیالات بھول گئے۔ جب تک نعمان بن بشیر انصاری نرمی اور تحمل سے شہر کا انتظام چلا رہا تھا، شیعوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر مجلس میں امام حسینؑ کی اعانت کا دم بھرتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ہم شام تک نعمان بن بشیر کا تعاقب کریں گے لیکن چونکہ انہیں عیسیٰ اللہ بن زیاد اور اس سے پہلے اس کے باپ کی حکومت کی سختی کا تجربہ تھا اس لیے جیسے ہی عیسیٰ اللہ نے کوفہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی ان کا رویہ بدل گیا۔ خیالات تبدیل ہو گئے۔ پہلے ان کی نظر میں نیکی کا معیار کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہو گیا ہے۔ پہلے جہاد کا دم بھرتے تھے مگر اب ”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ کا دم بھرتے لگے ہیں۔ جوں جوں کوفہ کے حالات ابن زیاد کے قابو میں آتے گئے، مسلم اور ان کے ساتھیوں کے لیے خطرہ بڑھتا چلا گیا اور کوفہ میں ان کی کامیابی کا امکان کم ہوتا گیا، اتنا ہی لوگوں کی ذہنی اور دینی کیفیت اس کے برعکس ہوتی گئی جس کا اظہار انہوں نے پیشتر کیا تھا یہاں تک کہ شہر کی ہوا بالکل بدل گئی۔ جو لوگ واقعی امام حسینؑ کو برسرِ اقتدار لانا اور بنی امیہ کو حکومت سے ہٹانا چاہتے تھے انہوں نے ایسی آنکھیں پھیریں کہ مسلم بن عقیس باوجودیکہ ان کا قیام مخفی تھا اور وہ بہت کم لوگوں میں آمد و رفت رکھتے تھے، شہر کی فضا، کو متعجب دیکھ کر مجبور ہو گئے کہ مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بہت بااثر اور طاقتور شخصیت ہانی بن عروہ مرادی کے یہاں رہائش اختیار کر لی۔ شیعہ بہت احتیاط سے اور چپکے چپکے ان کے پاس آتے تھے۔ اس وقت کوفہ کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ

سب خطوط جھوٹ کا پلندہ تھے۔ اب ان وعدوں پر جو لوگوں نے امام حسینؑ سے کیے تھے، بھر و سد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ابن زیاد نے اپنے غلام معقل کے ذریعے مسلم بن عقیل کی رہائش گاہ کا پتہ چلا لیا۔ ہوا یوں کہ اس نے معقل کو تین ہزار درہم دیے اور اس سے کہا کہ تو کچھ دن مسلم کے دوستوں سے میل جول بڑھا اور اپنے آپ کو بھی ان ہی میں سے ایک ظاہر کر۔ انہیں یہ رقم دیکر ظاہر کر کہ میں بھی تمہاری کامیابی کا خواہاں ہوں۔ تم یہ رقم لٹائی کی تیاری اور سامان جنگ کی فراہمی پر خرچ کرو۔ اس طرح ان کا اعتماد حاصل کر کے یہ پتہ لگاؤ کہ مسلم بن عقیل کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں پھر ان سے مل آؤ۔ معقل نے ابن زیاد کی ہدایت پر عمل کیا اور سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ سے راہ و رسم پیدا کی جو بزرگان شیعہ ہیں سے ایک تھے اور روز عاشورا شہید ہوئے۔ معقل نے سن رکھا تھا کہ مسلم بن عوسجہ بھی امام حسینؑ کے لیے بیعت لے رہے ہیں۔ معقل جو اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے ہر جھوٹ بولنے اور ہر بددیانتی سے کام لینے کے لیے تیار تھا، اس نے مسلم بن عوسجہ سے کہا کہ میں شام کا رہنے والا ہوں اور خدا نے مجھے اہلبیتؑ اور ان کے دوستوں کی محبت سے نوازا ہے۔ یہ کہہ کر مکہ و فریب کے ساتھ رونے لگا۔ مگر چھڑ کے آنسو بہانے کے بعد بولا: میرے پاس تین ہزار درہم ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بیان صاحب کو پیش کروں جن کے بارے میں سنا ہے کہ حجاز سے آئے ہوئے ہیں اور کوفہ میں فرزند پیغمبرؐ کے لیے بیعت لے رہے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ اس بہانے ان کی زیارت بھی کر لیتا مگر افسوس کہ میری ان تک رسائی نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ملا جو میری رہنمائی کرے اور میں یہ سعادت حاصل کر لوں۔ میں نے سب ہی سے پوچھا اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی اس پاک خاندان سے واقفیت ہے اس لیے

اب آپ سے اتنا س ہے کہ آپ یہ رقم لے لیں اور مجھے مسلم بن عقیل کے پاس لے چلیں۔ میں آپ کا مسلمان بھاتی ہوں۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ آپ چاہیں تو میں مسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔

مسلم بن عوسجہ نے کہا کہ مجھے تم سے مل کر اور یہ معلوم کر کے کہ شاید تم اہل بیتؑ کے کچھ کام آسکو، بڑی خوشی ہوئی مگر مجھے یہ پریشانی ہے کہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میرا بھی اس سے تعلق ہے۔ مجھے اس ظالم ابن زیاد کی طرف سے اندیشہ ہے۔ معتقل نے کہا خدا بہتری کریگا۔ آپ تو مجھ سے بیعت لے لیں۔ مسلم نے اس سے بیعت لی اور ساتھ ہی پختہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ خیر خواہ رہے گا اور اس راز کو ظاہر نہیں کرے گا۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ تمام عہد چمان کر لیے اور قسمیں اٹھائیں جو مسلم بن عوسجہ چاہتے تھے بلکہ شاید ان کی خواہش سے بھی بڑھ چڑھ کر باتیں بنائیں غرضیکہ مسلم کو بالکل مطمئن کر دیا۔ معتقل کئی دن تک ان کے مکان پر آنا جاتا رہا اور بالآخر مسلم بن عقیل کی خدمت میں باریاب ہو گیا اور وہاں دوبارہ بیعت کی۔ تین ہزار درہم مسلم بن عقیل کی اجازت سے ابو تمامہ صاعدی ہمدانی کو پیش کر دیے۔ ان کا شمار بھی بزرگانِ شیعہ میں ہوتا ہے اور یہ بھی کر بلا میں شہید ہوئے۔ اس وقت ہتھیار، خوراک اور رسد کی فراہمی ان کے ذمے تھی معتقل سب سے پہلے حضرت مسلم کی خدمت میں پہنچتا اور سب کے بعد رخصت ہوتا۔ اس طرح اس نے سب معاملات سے واقفیت حاصل کر لی اور اس کی باقاعدہ رپورٹ این زیاد کو دیتا رہا۔ ابن زیاد کو معلوم تھا کہ حضرت مسلم پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہائی کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ ہائی ابن زیاد کے خوف سے بیماری کے ہمانے خانہ نشین ہو گئے تھے اور دارالامارہ جانا چھوڑ

دیانتدار آخر زمان زیادہ کے حکم سے محمد بن اشعث، اسامہ بن خارجہ اور عمرو بن حجاج زبیدی ان کے پاس گئے اور ازراہ مصلحت ان کو سوار کرا کے اپنے ساتھ ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ہانی کی گرفتاری سے حالات کا رخ پوری طرح ابن زیاد کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ ہر چند ہانی نے اپنے گھر میں مسلم بن عقیل کی موجودگی سے لاعلمی ظاہر کی لیکن معقل نے مجلس میں پہنچ کر پردہ فاش کر دیا۔ ناچار ہانی کو اصل واقعہ کا اعتراف کرنا پڑا مگر انہوں نے کہا کہ میں مسلم کو اپنے مکان پر نہیں لایا بلکہ وہ خود میرے پاس آئے اور درخواست کی کہ میں انہیں اپنے یہاں ٹھہرا لوں۔ مجھے انکار کرتے ہوئے شرم آئی اس لیے میں نے ٹھہرا لیا۔ ہانی سب اطلاع درست ہے۔ اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی اور میں مسلم بن عقیل سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا یا کہیے تو میں ابھی جا کر ان سے معذرت کروں اور کہہ دوں کہ ان کا ہمال دل چاہے چلے جائیں۔

ابن زیاد نے دونوں باتیں نہیں مانیں اور کہا کہ انہیں فوراً ہمارے حوالے کر دو۔ جب وہ کسی طرح اپنے ہمان کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ابن زیاد نے اس لکڑی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی، ہانی کا منہ، ناک اور سر توڑ دیا اور انہیں قید کر دیا۔ اس کے بعد مسجد میں منبر پر جا کر مختصر سی تقریر کی اور لوگوں کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ ابھی منبر پر ہی تھا کہ مسجد میں تماشائی گھس آئے۔ لوگوں نے کہا کہ مسلم بن عقیل آگئے۔ عبید اللہ نے جدی سے اپنے محل میں جا کر دروازے بند کر دیے۔ حیرت ہے کہ بارہ یا سترہ ہزار لوگوں نے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر سعیت کی تھی لیکن جب انہیں ہانی کے واقعہ کی اطلاع ملی اور انہوں نے اپنے آدمیوں کو بلا یا اور انہیں بیگم باہر نکلے تو چار ہزار سے زیادہ جمعیت فراہم نہ ہو سکی۔ اس سے بھی زیادہ

حیرت اس پر ہے کہ اس وقت تو چار ہزار مسلح آدمی بھی مسلم کے ساتھ تھے، ابن زیاد نے اپنے محل کے دروازے بند کر لیے تھے اور اس کے ساتھ پچاس سے زیادہ آدمی نہیں تھے تیس پاسبان اور بیس مقررین اور خود اس کے اہل خانہ۔ لوگوں نے اس کے محل کو گھیر لیا تھا۔ اسے اور اس کے باپ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اس وقت فضا بظاہر مسلم بن عقیل کے حق میں تھی لیکن شام تک اس قدر ان کے خلاف ہو گئی کہ ۹ ذی الحجہ کی شام کو مغرب کی نماز میں ان کے ساتھ صرف تیس آدمی تھے اور جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو فقط دو آدمی ان کے ساتھ تھے اور جب وہ مسجد کے باہر پہنچے تو کوئی ایک آدمی بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

فَلْيَحْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلْيَحْلَمَنَّ

الْكَاذِبِينَ ○ (سورہ عنکبوت۔ آیت ۳)

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ کوفیوں کی جاں نثاری کے دعووں کی تلقی اس وقت کھل گئی جب چار ہزار آدمی ابن زیاد کو جس کے ساتھ پچاس سے زیادہ آدمی نہیں تھے فخر سے باہر نہ نکال سکے اور ابن زیاد کے آدمیوں کی محض کیدر بھکی سن کر کہ شام کا لشکر آیا چاہتا ہے بھاگ کھڑے ہوئے۔

### مسلم بن عقیل کی شہادت

کوفہ کی صورت حال ایسی نازک ہو گئی تھی کہ غلصہ شیعہ بزرگوں جیسے سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجبه اور رفاعہ بن شداد کا بھی کہیں پتانا نہ تھا۔ طبری اور شیخ مفید دونوں نے تقریباً ایک ہی الفاظ میں لکھا ہے کہ جب مسلم بن عقیل مسجد سے باہر نکلے تو وہ بالکل تنہا تھے اور کوئی اتنا بھی نہیں تھا کہ انہیں گھر کا راستہ ہی

بتلاتا یا اگر دشمن سے سامنا ہو جائے تو کچھ مدد کرتا۔ وہ کوفہ کی گلیوں میں سرگرداں پھر رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کدھر جائیں۔

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا غیر مناسب نہ ہو گا۔ صدیوں سے اہل کوفہ کی بے وفائی کی وجہ سے ان پر نکتہ چینی کی جارہی ہے۔ جہاں لوگ امام حسینؑ کے یارانِ با وفا اور اصحابِ بے ریا پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہیں ان لوگوں پر لعنت اور نفرین کرتے ہیں جنہوں نے نصرت و حمایت کے سارے دعووں سے روگردانی کر کے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی اور جب تک جان ہی نہ لے لی باز نہ آئے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اہل کوفہ نے کوئی ایسی انہونی بات نہیں کی جس پر حیرت کا اظہار کیا جائے۔ اللہ کا رویہ بالکل قاعدے کے مطابق تھا۔ اس وقت بھی جب انہوں نے خطوط لکھے اور اس وقت بھی جب وہ شمشیر برہنہ امامؑ کے مقابلے پر آئے۔ جب امن و امان تھا اور کوفہ کی حکومت ایک نرم روحانک یعنی نعمان بن بشیر کے ہاتھ میں تھی وہ اس اندرونی بصیرت کی بنا پر جو خدا نے متعال نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی ہے، حق و باطل میں خوب تمیز کرتے تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امانت اور رہبرِ مصلحت کا صحیح مستحق کون ہے۔ ان کا یہ فعل بالکل معمول کے مطابق اور قاعدے کی بات تھی کیونکہ ہر شخص صحیح راستے اور غلط راستے کو پہچانتا ہے اور ان کے تعین میں اس وقت تک غلطی نہیں کرتا جب تک کسی خاص وجہ سے وہ فطری راستے سے ہٹ نہ جائے اور خوف، لالچ اور نفع و نقصان کا خیال اسے گمراہ نہ کرے۔ اللہ فرماتا ہے:

الْمَجْعَلُ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَ لِسَانًا وَ شَفَتَيْنِ ۝  
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (سورۃ بلد - آیات ۸-۱۰)

لیکن جب ان ہی حق و باطل شناس لوگوں کو امتحان کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، سود و زیاں کا سوال پیدا ہوا اور مصلحت و وقت اور دین کے راستے ایک الگ ہو گئے۔ تب انہوں نے وہی کچھ کیا جو اس قسم کے حالات میں اکثر لوگ کرتے ہیں یعنی حق اور اہل حق سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بجائے جہادِ جاں نثاری اور اصلاح کے، حزم و احتیاط اور دورانِ اندیشی کی باتیں کرنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہل کوفہ نے ادائے فرض کے لیے اپنی جان کی بازی نہیں لگائی۔

جنہیں اس بات پر حیرت ہو انہیں چاہیے کہ وہ یہ سوچیں کہ اگر وہ خود ان حالات میں ہوتے تو کیا کرتے؟ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کریں کہ کیا ان کا وہی اہل کوفہ سے مختلف ہوتا؟ حیرت تو ان لوگوں پر ہے جنہوں نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور آخر دم تک حق پر ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ اسی راہ میں جان فدی۔ جب ان کے جسم لٹے کھڑے کٹ کٹ کر زمین پر گر رہے تھے، وہ یہی سوچ رہے تھے کہ جاں نثاری اور حق پرستی کا حق ادا ہوا کہ نہیں، اکیس اسیانہ ہو کہ روزِ قیامت خدا اور رسولؐ کے سامنے شرمندگی ہو۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عمر و بن قریظہ انصاری کے والد قریظہ بن کعب خزرجی اصحابِ رسولؐ میں سے تھے۔ جنگِ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شرکت کی۔ خلافتِ عمر میں کوفہ آئے۔ وہاں علمِ فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ عمرو بن عبد اللہ بن مسعود کے جاں نثار ساتھیوں میں سے تھے۔ ابنِ طاووس نے لہوف میں لکھا ہے کہ روزِ عاشورا جب تک یہ تھمولا



سے چور ہو کر زمین پر گر نہیں گئے، امام پراچ نہیں آنے دی تیروں کو اپنے ہاتھوں پر لیتے رہے اور تلواروں کے وار اپنے جسم پر سنتے رہے۔ جب خاک پر گر کر ترپنے لگے تو یکبارگی امام کی طرف دیکھ کر کہا:

ع نازم از زندگی خویش کہ کار سے کرم  
فرزند رسول! کیا میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا؟  
تکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے  
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

سالار شہیدان نے فرمایا: ہاں، اور تم مجھ سے پہلے جنت میں جا رہے ہو۔ رسول خدا کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ تسبیح (علیہ السلام) بھی آ رہے ہیں۔

ان جیالوں کی ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا کیا کہنا! واقعی حیرت ہوتی ہے۔ سلام ہوان کی پاک ارواح پر۔ زندگی نے کتنے ہی رخ بدلے اور حوادث کے کتنے ہی تیر برسے لیکن ان کی وضع داری میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

ع پھر تا ہے سبیل حوادث سے کہیں مردوں کا منہ

کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے ضحاک بن عبداللہ مشرقی ہمدانی کا قصہ پڑھا یا سنا ہوگا اور اسکی کم توفیقی، بے نصیبی اور عاقبت نماندیشی پر تاسف کیا ہوگا، انہیں تعجب ہوا ہوگا کہ اس شخص نے عین معرکہ کارزار میں رخصت کی اجازت طلب کی اور اپنے امام کو دشمنوں کے زرخے میں چھوڑ کر چلا گیا لیکن یہ کم ہی کسی نے سوچا ہوگا کہ جتنی ہمت اس نے دکھائی کیا ان حالات میں ہم دکھا سکتے تھے۔ اس پر حیرت نہیں ہوتی چاہیے کہ وہ بالآخر چلا گیا۔ حیرت تو اس پر ہے کہ اس نے اتنی دیر تک ساتھ

کیسے دیا کہ جنگ میں بھی شرکت کی۔ طبری نے ضحاک کی کہانی خود ضحاک کی زبانی نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اور مالک بن نضر اجمی، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کر کے ان کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ امام حسینؑ نے ہمیں خوش آمدید کہا اور پوچھا کیسے آئے؟ ہم نے عرض کیا، سلام کرنے اور دعائینے کے لیے۔ تجدید ملاقات کا بھی قصد تھا اور آپ کو یہ اطلاع دینی تھی کہ اہل کوفہ آپ سے جنگ پر آمادہ ہیں۔ امامؑ نے یہ سن کر کہا "حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" پھر جب ہم رخصت ہونے لگے اور سلام دعا کے بعد خدا حافظ کہا تو امامؑ نے فرمایا: کوئی حرج نہ ہو تو میرے ساتھ رہ کر میری مدد کرو۔ مالک بن نضر نے کہا کہ میں مقروض ہوں اور میرے ساتھ بیوی بچے بھی لگے ہوئے ہیں اس لیے مجبور می ہے۔ میں نے کہا میری بھی بیوی بچے ہیں مگر بہر حال میں جاں نثاری پر آمادہ ہوں بشرطیکہ آپ یہ اجازت دیں کہ جب آپ اکیلے رہ جائیں اور میری مدد بیکار ہو جائے تو میں اپنا راستہ لوں۔ امامؑ نے یہ شرط منظور کر لی۔ میں ان کے ساتھ رہا۔ روز عاشورا جب آپ کے اصحاب شہید ہو گئے اور دشمن خود امامؑ اور جو انان اہل بیت تک پہنچ گیا اور آپ کے اصحاب میں سوائے سوید بن عمرو بن ابی مطار غنصعی اور بشر بن عمر و حضرمی کے کوئی نہ رہا تو میں نے عرض کیا کہ اے فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان یہی طے پایا تھا کہ جب تک آپ کے ساتھ زنده رہیں گے میں آپ کا ساتھ دوں گا اور جب وہ مارے جا چکیں گے تو پھر میں آزاد ہوں گا جہاں چاہے جاؤں۔ فرمایا: یہ تو درست ہے مگر اس لشکر سے بچ کر کیسے جاؤ گے؟ اگر تمہیں موقع ملتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ضحاک کہتا ہے کہ اس وقت عمر بن سعد کے سوار ہمارا بیچھا کر رہے تھے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایک جیسے میں باندھ دیا تھا اور پیدل جنگ کر رہا تھا۔

میں نے اس روز امام کے دشمنوں میں سے دو کو قتل کیا اور ایک کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس روز امام نے کئی بار مجھے شاباش دی اور کہا جزاک اللہ دست و بازو سلامت! جب انہوں نے مجھے چلے جانے کی اجازت دیدی تو میں نے اپنا گھوڑا باہر نکالا اور اس کی نشت پر سوار ہو گیا۔ میں نے گھوڑے کو اتنے چابک لگائے کہ گھوڑا الف ہو گیا۔ پھر میں نے ایک دم اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ دشمن کے سپاہیوں نے مجبوراً راستہ دیدیا اور میں ان کی صفوں کے بیچ سے نکل آیا۔ گیارہ آدمیوں نے میرا تعاقب کیا اور قریب تھا کہ میرے نزدیک پہنچ کر وہ مجھے گرفتار کر لیتے مگر کثیر بن عبد اللہ شعبی، ایوب بن مسرح، حیوانی اور قیس بن عبد اللہ صاعدی نے مجھے پہچان لیا اور انکی سفارش سے میری جان بچی۔

تمی دستمانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل  
کہ خضر از آبِ حیوانِ تشنہ می آرد سکندر را

صحیح ہے کہ اس شخص کے حال پر افسوس ہوتا ہے کہ ایسی سعادت کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیا اور ایسے امام کو اکیلے چھوڑ کر چلا آیا حالانکہ وہ بھی حبیب بن مظاہر اسدی اور بربر بن خضیر ہمدانی ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس کا حال اہل کوفہ سے مختلف تھا، جاہل نزاری کا عہد نہیں کیا تھا نہ مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جب امام کی خدمت میں پہنچا تو جو کچھ کہا اسے پورا کیا اور جاہل نزاری کا دم نہیں بھرا۔ اس نے خود بتلادیا تھا کہ میں کہاں تک ساتھ دینے پر آمادہ ہوں؟ لیکن جن لوگوں نے مسلم سے بیعت کی تھی انہوں نے ۹ ذی الحجہ کی شب میں انہیں کوفہ کی گلیوں میں تنہا چھوڑ دیا۔ اگر ایک بڑھیا، ایس اپنے گھرنے لے جاتی اور پانی نہ پلاتی تو کوئی اتنا بھی نہیں تھا کہ یہ خدمت انجام دے سکتا۔ اپنی زندگی کی آخری رات

مسلم نے اسی بڑھیا کے گھر بسر کی۔ اگلے روز ابن زیاد نے ان کی گرفتاری کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کے فرستادوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا تو ناچار مسلم باہر نکلے اور شہادت کے لیے تیار ہو گئے۔ جس وقت آپ کو گرفتار کیا گیا آپ نے محمد بن اشعث سے بیخوابی کی کہ کسی کو امام حسینؑ کے پاس بھیج کر میری شہادت کی اطلاع دیدو۔ آپ نے کہا کہ میری طرف سے امام حسینؑ کو کہلوادو کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اپنے اہلبیتؑ کو لیکر واپس چلے جائیے اور اہل کوفہ کے دھوکے میں نہ رہیے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق آپ کے والد محترم کہا کرتے تھے کہ کاش میں مر جاؤں یا قتل ہو جاؤں تاکہ ان سے نجات ملے۔

اہل کوفہ نے آپ سے جھوٹ بولا اور مجھ سے بھی۔ اب جھوٹ کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ مسلم نے ابن زیاد کی مجلس میں عمر بن سعد سے دوخا ہمیشیں کیس۔ ایک تو یہ کہ میری زہ اور تلوار بیچ کر سات سو درہم جو میرے ذمے قرض ہے ادا کر دینا، دوسرے یہ کہ ابن زیاد سے میری لاش لیکر دفن کر دینا۔ اسی دن مسلم اور ہانی شہید کر دیے گئے اور ان دونوں کے سر کاٹ کر یزید کے پاس شام بھیج دیے گئے۔

حیف در چشم زون صحبت یار آخر شد  
روئے گل سیر ندیدیم و ہزار آخر شد

### محمد بن حنفیہ

قبل ازیں ہم نے رجب سنہ ۶۰ھ کے وسط میں مرگ معاویہ سے لیکر مسلم بن حنفیل اور ہانی بن عروہ مرادی کی شہادت تک کے واقعات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ عبید اللہ بن زیاد کو کس طرح عراق پر کامل تسلط حاصل ہو گیا تھا۔ ہم نے یہ بھی

بیان کیا ہے کہ جب امامؑ اپنے افراد خاندان کے ساتھ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے تو ان کے بھائی محمد بن حنفیہ مدینہ ہی میں رہ گئے۔ محمد بن حنفیہ کی والدہ کا تعلق قبیلہ بنی حنفیہ سے تھا۔ اسی وجہ سے انہیں محمد بن حنفیہ کہتے ہیں۔ وہ مرد بزرگ، دلیر اور بانقوی تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا ایک فرقہ کیسانیرا انھیں اپنا امام ماننا ہے مگر وہ خود اپنے والد امیر المؤمنینؑ کے بعد اپنے بھائی حسنؑ کی ان کے بعد دوسرے بھائی امام حسینؑ کی اور ان کے بعد اپنے بھتیجے امام علیؑ بن حسینؑ کی امامت کے قابل تھے۔ ان کا شمار اہل بیتؑ کے سربراہ اور وہ لوگوں میں ہے۔ انہوں نے امیر المؤمنینؑ کے ساتھ جنگوں میں مردانگی کے جوہر دکھائے تھے۔ معاویہ کے زمانے میں رومی بادشاہ نے دو پہلوان، ایک طاقتور اور فدا اور دوسرا شہ زور اور قوی پنج مسلمان پہلوانوں سے مقابلے کیلئے شام بھیجے معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا تو شخص سے تو مقابلے کیلئے ہمارے پاس قیس بن سعد موجود ہیں لیکن دوسرے کیلئے کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو اس سے زور آزمائی کر کے اسے نیچا دکھا سکے۔ عمرو نے کہا کہ میری نظر میں دو آدمی ہیں لیکن آپ ان دونوں کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ ایک تو محمد بن حنفیہ ہیں دوسرے عبداللہ بن زبیر۔ معاویہ نے کہا ان دونوں میں جو یہاں سے نزدیک ہو اسے بلاؤ۔ عمرو نے اس کام کے لیے محمد بن حنفیہ سے درخواست کی۔ معاویہ نے ایک مجلس عام منعقد کی جس میں اعلیٰ عہدیدار اور سربراہ اور وہ لوگ بھی حاضر تھے۔ شہ زور پہلوان زور آزمائی کے لیے محمد بن حنفیہ کے سامنے آیا۔ انہوں نے کہا کہ یا تو تم بیٹھ جاؤ اور اپنا ہاتھ مجھے پکڑ دو تاکہ میں تمہیں اٹھا کر پھینک دوں یا پھر میں بیٹھ جاتا ہوں، تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دو تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم میں سے کون زیادہ زور آور ہے۔ اب بتاؤ تم بیٹھے ہو یا میں بیٹھوں۔ اس نے کہا۔

آپ بیٹھے۔ محمد بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ رومی پہلوان کے ہاتھ میں دیدیا۔ رومی نے ہر چند زور لگایا لیکن محمد بن حنفیہ کو جنبش بھی نہ دے سکا اور اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا۔ اب محمد کھڑے ہو گئے اور رومی پہلوان بیٹھ گیا۔ محمد نے ایک ہی جھٹکے میں اسے ہوا میں اچھال کر دور پھینک دیا۔ حاضرین نے تحسین و آفرین کی اور معاویہ بھی خوش ہوئے۔

اب دوسرا قہر آور پہلوان، قیس بن سعد کے مقابلے کے لیے سامنے آیا۔ قیس بن سعد نے ایک کونے میں جا کر اپنا زیر جامہ اتار کر اسے دیا اور کہا اسے پہن لو۔ رومی نے چرہ پنا تو وہ اس کے سینے تک آ گیا اور پاؤں کی طرف سے بھی نیچے لٹکتا رہا۔ رومی پہلوان شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ بزرگان انصار اس بات سے بہت بجزز ہوئے کہ بھری صف میں قیس نے زیر جامہ اتار کر قیس نے چند اشعار کہہ کر معذرت کر لی۔

### محمد بن حنفیہ کے لیے امامؑ

#### کا وصیت نامہ

جس وقت امام حسینؑ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے انہوں نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ لکھا جو ابن طاووس نے نقل کیا ہے۔ اس میں امامؑ نے اپنے قیام کا محرک بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آپ مختلف حالات میں کیا طریق کار اپناتے تھے۔ اس کے علاوہ امامؑ نے ان باطل محرکات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو انسان کو اکساتے ہیں اور شہوات اور فحشانی خواہشات کی نگہبیل کے لیے جنگ پر آمادہ کرتے ہیں لیکن مردانِ حق ایسے محرکات سے پاک

ہوتے ہیں۔ نیز یہ بتایا ہے کہ مردانِ حق کی تحریکِ نفسانیت سے پاک ہوتی ہے۔  
وصیت نامہ یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”یہ وصیت ہے حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کی محمد عرف ابنِ حنفیہ کے نام۔ میں حسینؑ کو ابھی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ حق لیکر آئے۔ جنتِ حق ہے، جہنمِ حق ہے اور اس میں شک نہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس دن اللہ مردوں کو زندہ کرے گا۔“

یہ سب وہی عقائد ہیں جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور ان عقائد کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ان کے تذکرے سے امام کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت یہ اصولِ خطرے میں ہیں اور اگر معاملہ یونہی چلنے دیا گیا تو عین ممکن ہے کہ حکومتِ وقتِ اصولِ دین سے بھی تعرض کرنے سے گریز نہ کرے واصل امام کی تحریک کا اصل محرک یہی بنیادی اصول تھے جن پر مسلمانوں کے تمام مذہبی اور اجتماعی معاملات کا دار و مدار ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا تھا:

”میری تحریک کا مقصد نہ زیادتی ہے نہ سرکشی اور نہ ہی یہ نفسانیت پر مبنی ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ فساد پھیلاؤں یا کسی پر ظلم کروں۔ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں اور اپنے نانا اور اپنے

والد کی سیرت کی پیروی کر رہا ہوں۔“

اس وصیت نامے میں ان میں سے کوئی بات نہیں جو آجکل کے وصیت ناموں میں عموماً لکھی جاتی ہیں۔ اس میں اپنے لیے فاتحہ دلانے اور ایصالِ ثواب کرنے کی وصیت نہیں کی گئی ہے بلکہ امامؑ تو صرف اپنی تحریک کا مقصد واضح کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے بتا دیا کہ میری تحریک کا مقصد نہ کوئی تفریح ہے نہ مال و دولت جمع کرنا، نہ کسی نپٹلم ڈھانا اور نہ فساد پھیلانا۔ یہ جملہ کہ ”میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں“ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۳۰۰ھ میں امت کو کسی شدید مذہبی اور اجتماعی بحران کا سامنا تھا جسے دور کرنے کے لیے خونیں انقلاب کی ضرورت تھی جو حسین بن علیؑ کے ہاتھوں ہی انجام پاسکتا تھا، جن کی عظمت کی گواہی قرآن نے سورۃ الزاب میں ایہ تطہیر میں دی ہے۔ جو فساد اس وقت رونما تھا وہ مقالات اور خطبات سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

”اگر لوگ میری دعوت قبول کرتے اور حق کو تسلیم کرتے ہیں تو خیر اور اگر قبول نہیں کرتے تو میں صبر کروں گا“

یہاں صبر سے مراد یہ نہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤں گا کہ مزید جو دل چاہے کرے بلکہ صحیح معنی میں صبر مراد ہے جو امامؑ کے شایان شان ہے اور ایمان اور تہذیب پرستی کی اساس ہے یعنی پھر میں — تن تنہا ہی اس راستے کو طے کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا تھا:

”میرے بھائی یہ میری وصیت ہے تمہارے لیے۔ میں صرف خدا



سے توفیق کا طلب گار ہوں۔ اسی پر میز بھر دیا ہے اور اسی کے پاس ہمیں  
لوٹ کر جانا ہے“

## امام کے قیام کی وجوہات

اگر ہم واقعی امام حسینؑ کی تحریک کے اسباب معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں اس کی ابتدا معلوم کرنے کے لیے کم از کم تیس سال پہلے کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہو گا کیونکہ ۲۹ھ یا ۳۰ھ ہی سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ اس تحریک کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ عثمان بن عفان اموی نے تقریباً بارہ سال حکومت کی۔ ان کی خلافت کے آخری چھ سالوں میں اسلامی حکومت کی ہیبت کدڑی نہیں تبدیل ہوتی تھی۔ اہولاً اسلامی حکومت میں ہونا یہ چاہیے کہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ باقی معاملات میں البتہ لوگ آزاد ہیں لیکن اب یہ صورت ہو گئی تھی کہ سب ہی معاملوں میں لوگ آزاد ہو گئے تھے صرف خلیفہ کے مفاد کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے بیت المال کو لوٹنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کی دولت اور جائیدادوں پر قبضہ جمالیا۔ وہی بیت المال جس کی علی بن ابی طالبؑ نے اپنے زمانہ خلافت میں بھر پور نگرانی کی۔ یہی طرز عمل شیخین کا تھا۔ خود عثمان بھی اپنی خلافت کے اوائل میں بڑی حد تک آمد و خرچ کے معاملے میں ضروری احتیاط برتتے تھے لیکن بعد میں بجائے اس کے کہ دولت مسلمانوں کے عمومی مصالح میں صرف ہوتی، بعض افراد کے ہاتھ لگ گئی اور جائیدادیں ان کے نام چڑھنا شروع ہو گئیں۔ یہی بدعنوانیاں جو تیس سال پیشتر شروع ہوئی تھیں، اس بات کا سبب بنیں کہ تیز و تند خونیں انقلاب کی ضرورت

محسوس ہونے لگی۔ مسعودی مروج الذهب میں لکھتا ہے کہ خلیفہ سوم نے اپنی رحلت کے وقت پچاس ہزار دینار طلائی اور دس لاکھ درہم ترکہ میں چھوڑے، حالانکہ اسی مسعودی نے لکھا ہے کہ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ نے برسرِ منبر اعلان کیا کہ میرے والد نے از قلم سیم وزر کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ صرف سات سو درہم ہیں جو آپ نے وظیفے سے اس لیے پس انداز کیے تھے کہ خانگی ضرورت کے لیے خادم کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے بعد مسعودی لکھتا ہے کہ وادی القریٰ اور دوسری جگہوں پر خلیفہ سوم کی جائداد کی قیمت ایک لاکھ دینار تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں اور اونٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد انھوں نے ترکہ میں چھوڑی۔

زیر کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بصرہ کے مشہور محل کے علاوہ بہت سے مکانات بصرہ، کوفہ اور اسکندریہ میں تعمیر کرائے تھے اور مرتے وقت پچاس ہزار دینار طلائی، ایک ہزار کینز و غلام اور بہت سی جائداد مختلف شہروں میں چھوڑی۔ طلحہ بن عبد اللہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ انکی عراق کی جائداد کی آمدنی ایک ہزار دینار روزانہ تھی۔ اس کے علاوہ شام میں بھی بہت جائداد تھی۔

ایک اور صحابی عبد الرحمن بن عوف تھے۔ ان کے اصطلح میں سو گھوڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار دنٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں ان کے پاس تھیں۔ انتقال کے وقت چار بیویاں تھیں اور چونکہ اولاد بھی تھی اس لیے میراث میں انکی بیویوں کو ۱/۸ حصہ ملا۔ ہر بیوی کا حصہ ۳۲/۸۴ ہوا۔ اس ۳۲ حصے کی قیمت ۸۴ ہزار دینار تھی۔ زید بن ثابت نے اتنا سونا چاندی ترکہ میں چھوڑا کہ ہتھوڑوں سے توڑ کر تقسیم کیا گیا۔ ان کی باقی جائداد کی قیمت ایک لاکھ دینار طلائی بنتی تھی۔

یعلیٰ بن امیہ کی والدہ کا نام منیہ تھا اس وجہ سے یعلیٰ بن منیہ بھی کہا جاتا ہے

امیرالمومنینؑ کے خلاف جنگ جمل، یعنی ہی کی مالی امداد کے بل بوتے پر لڑی گئی تھی۔ مرتے وقت پانچ لاکھ دینار تک میں چھوڑے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے ذمے بڑی رقمیں تھیں۔ جائداد وغیرہ کی مالیت تین لاکھ دینار تھی۔

مسعودی خود لکھتا ہے کہ عمر بن خطاب کے زمانے میں یہ صورت نہیں تھی بلکہ ہر کام صاف اور سیدھے طریقے پر تھا۔ زرکی وصولی اور تقسیم کا طریقہ اور طرز حکومت ایسا نہیں تھا کہ کسی کو اس طرح دولت جمع کرنے کا موقع مل سکے۔

عثمان کے بعد علیؑ برسر اقتدار آئے تو ان کے سامنے سب سے اہم کام جس پر جنگیں بھی ہوئیں، یہی تھا کہ بااثر لوگوں کو قابو میں رکھیں، بدعنوانیوں کو روکیں اور کسی کو بیت المال سے ایک دینار بھی حساب کے بغیر نہ لینے دیں۔ علیؑ کو ساڑھے چار سال تک انہی لوگوں سے لڑنا پڑا جو اس طرح کی کمائی سے محروم ہو گئے تھے۔ علیؑ اسکا کرتے تھے کہ جب تک میں برسر اقتدار ہوں دوبارہ لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جن لوگوں نے ناجائز دولت کمائی ہے انہیں بھی واپس کرنا ہوگی۔ اسی بنا پر علیؑ شہید کر دیے گئے۔

## صلح امام حسنؑ

امیرالمومنینؑ کے بعد امام حسنؑ اپنے والد کے جانشین ہوئے اور خلافت اسلامی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس وقت مسلمانوں کی اجتماعی صورت حال نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں کی طاقت دو محاذوں یا دو فریقوں کے درمیان اس طرح برابر تقسیم ہو گئی تھی کہ اگر امام حسنؑ معاویہ کے خلاف جنگ جاری رکھتے تو سخت خونریزی کے بغیر کسی فریق کی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ بے شک خونریزی کو

روکنے کے لیے امام حسنؑ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ اگر وہ امیر معاویہ سے مزاحمت جاری رکھتے تو اس کا فائدہ بیرونی محاذ پر صرف مشرقی رومی سلطنت کو اور اندرون ملک خوارج کو پہنچتا۔ اگر وہ چار پانچ ہزار مسلمان بھی جو جان کی بازی لگائے ہوئے تھے، معاویہ سے جنگ میں الجھ جاتے تو پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ رومی سلطنت کی طرف سے مسلمانوں پر کیا آفت نازل ہوئی، خوارج کا خطرہ کیا صورت اختیار کرتا اور اسلامی تاریخ کیا سے کیا ہو جاتی۔ امام حسنؑ نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی تاریخی بردباری سے نہ صرف مسلمانوں کو مزید خونریزی سے بچایا اور اسلامی طاقت کو محفوظ رکھا بلکہ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے منصوبے خاک میں ملا دیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے بالکل ہتھیار ڈال دیے اور معاویہ کی خلافت تسلیم کر لی۔

امام حسنؑ اور امیر معاویہ کے مابین صلحنامے کی ایک شرط یہ تھی کہ حسنؑ بن علیؑ معاویہ سے صلح کرتے ہیں اس شرط پر کہ وہ معاویہ کو امیر المؤمنین کہنے کے پابند نہیں ہوں گے مطلب یہی تھا کہ وہ معاویہ کو خلیفہ اور امیر المؤمنین تسلیم نہیں کرتے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ نے خلافت سے دستکش ہو کر معاویہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور دوسرے عام مسلمانوں کی طرح معاویہ کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیا اور ان کے تابع فرمان ہو گئے، وہ ابن اثیر کی اس دقیق روایت پر غور کریں۔

جب امام حسنؑ کنارہ کش ہو گئے اور معاویہ نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی تو فرد بن نوفل اشجعی خارجی نے جو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ باقی خوارج سے الگ ہو کر شہر زور چلا گیا تھا، کہا کہ اب معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد جنگ ضروری ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے عراق کا رخ کیا اور کوفہ کے خلیفان تک پہنچ گئے۔

امام حسنؑ کو ذرہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے معاویہ کو جب خبر ملی کہ اس خارجی نے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ سرکشی اختیار کی ہے تو امام حسنؑ کو صلح کی بنیاد مضبوط کرنے کے خیال سے خط لکھا اور انہیں ہدایت کی کہ فرزدہ بن نوفل خارجی سے جنگ کریں اور اسے کو ذرہ سے نکال دیں۔ یہ بھی لکھا کہ فرزدہ کا قصد پاک کرنے کے بعد آپ کی مدینہ روانگی میں کوئی مضائقہ نہیں جس وقت امام حسنؑ کو یہ خط ملا وہ قادسیہ میں یا قادسیہ کے نزدیک کسی جگہ تھے۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ اے معاویہ تو حسنؑ بن علیؑ کو اس کام پر مامور کرتا ہے کہ وہ تیرے ایک افسر کی حیثیت سے جائے اور ایک سرکش خارجی کو زیر کرے۔ میں حسنؑ بن علیؑ ہوں اور خلافت پر میرا حق ہے جو میں نے مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر چھوڑ دی ہے۔ اگر میں کسی اہل قبلہ یعنی کسی بھی عقیدے کے حامل مسلمان سے لڑائی کو پسند کرتا تو پہلے تم سے لڑتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو سب لوگوں کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ دور ہے لیکن میں نے تجھے چھوڑ دیا۔

غور کیجیے کہ امامؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں نے تمہاری خلافت تسلیم کر لی، یہ کہا کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ شاید مطلب یہ ہو کہ میدانِ سیاست میں چھوڑ دیا اور خود اس لیے کنارہ کشی اختیار کر لی کہ بے فائدہ مسلمانوں کا خون نہ بے کیونکہ دونوں طرف طاقت کا توازن برابر تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو دونوں فریق ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر کمزور ہو جاتے اور اس کا فائدہ بیرونی اور اندرونی دشمنوں ہی کو پہنچتا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے بھی ۴۹ھ سے لیکر ۶۰ھ تک معاویہ کی زندگی میں تلوار نہیں اٹھائی یعنی وہ اقدام نہیں کیا جو یزید کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ضروری سمجھا لیکن وہ معاویہ کی غلطیوں پر نکتہ چینی اور تنبیہ ضرور کرتے رہے۔ چونکہ ان کے بھائی حسنؑ نے اس مختصر خط میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے معاویہ کی

حقانیت کا ابطال کیا تھا اس لیے امام حسینؑ کی حکمتِ عملی بھی یہی رہی۔

## معاویہ کے نام امام حسینؑ کا خط

اپنے بھائی کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جو ابنِ قتیبہ دینوری نے نقل کیا ہے۔ اس میں آپ نے لکھا:

کیا تم نے حجر بن عدی اور ان کے عبادت گزار دوستوں کو قتل نہیں کیا جو بدعت کو برا سمجھتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے؟ تم نے انہیں امان دینے اور ان سے عہد و پیمان کرنے کے بعد ازراہِ ظلم و ستم ان کو قتل کر دیا۔ تم نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑنے کی جرأت کی اور اسے معمولی بات سمجھا۔ کیا تم نے عمرو بن الحمق کو قتل نہیں کیا جس کا جسم عبادت کی کثرت سے گھلی چکا تھا؟ تم نے ان سے ایسے عہد و پیمان کیے تھے کہ انہیں سن کر آہوان کو ہی بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر نیچے اتر آتے۔ کیا تم نے نامعلوم باپ کے بیٹے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار نہیں دیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ تھا کہ بچہ اس کا ہوتا ہے جس کے گھر پیدا ہو اور زانی کو سنگسار کر دیا جائے؟ پھر تم نے اسی زیاد کو اہل اسلام پر مسلط کر دیا جو انہیں قتل کرتا ہے، ان کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہے اور انہیں کھجور کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دیتا ہے۔ سبحان اللہ! معاویہ! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس امت سے کوئی تعلق نہیں۔

اگے چل کر آپ نے لکھا:

معاویہ! اللہ سے ڈرو جس کے یہاں ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ان باتوں کو بھولنے والا نہیں کہ تم الزام لگا کر لوگوں کو

قتل کر دیتے ہو۔ تم نے ایسے لونڈے کو مسلمانوں کا امیر بنا دیا ہے جو شراب پیتا ہے اور کتوں سے کھینتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اپنے دین کو برباد کر دیا اور امت مسلمہ کو کمزور کر دیا۔

یہ تھا امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا معاویہ سے طرزِ منہجِ طبع۔ وہ اس طرح کے خط لکھتے تھے اور اس طرح باز پرس کیا کرتے تھے۔

یہ جاننے کے لیے کہ یزید کے بارے میں امام حسینؑ نے جو کچھ لکھا وہ کہاں تک صحیح ہے مسعودی سے سنیے:

### یزید کا تعارف

مشہور مورخ مسعودی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یزید ایک غیاثی آدمی تھا۔ اس نے شکار ہی جانور کتے، بے سندر اور چیتے پالے ہوئے تھے۔ اس کے پیماں شراب کی عافیں جمتی تھیں۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایک دن جب یزید شراب پی رہا تھا اور ابن زیاد اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اس نے ساتی کی طرف رخ کر کے شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

ساقیا! ایسا جام پلا جو میری ہڈیوں کو سیراب کرے۔ پھر ایسا ہی ایک جام ابن زیاد کو دے جو میرا ہمارا اور معتقد ہے اور جس نے میری کامیابیوں اور خوشیوں کو مستحکم کیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ابن زیاد نے حسینؑ کو قتل کر کے میری خلافت کی بنیاد کو مستحکم اور مضبوط کر دیا ہے۔

اس کے بعد مسعودی، یزید کے مظالم کے متعلق کچھ فقرے لکھ کر کہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا فرعون تھا بلکہ فرعون اپنی رعایا کے لیے زیادہ عادل اور منصف مزاج تھا۔ پھر لکھتا ہے کہ اس کی بدعنوانیاں اور بے باکیاں مسلمان قوم میں بھی سراپا

کر گئی تھیں۔ جو گناہ بڑید کرتا تھا وہ اس کے مقررین بھی کرتے تھے۔ انہوں نے بھی وہی عادتیں اختیار کر لی تھیں۔ بڑید کے دور میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا رواج ہوا۔ لوگ بے محابا شراب پینے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو شخص جانٹین رسول ہونے کا مدعی اور مسندِ خلافت پر متمکن تھا، اس نے بندر پالا ہوا تھا جس کا نام ابو قیس تھا۔ اسے مجلسِ میگناری میں لاکر ایک گدی پر بٹھایا جاتا۔ اُسے ایک گدی پر بھی سوار کرایا جاتا جسے گھڑ دوڑ میں حصہ لینے کی تربیت دی گئی تھی۔ اس پر زین کس کر اور لگام لگا کے اس بندر کو بٹھا دیا جاتا اور وہ گدھی گھوڑوں کے ساتھ دوڑتی۔ ایک دن ابو قیس کی گدھی دوڑ جیت گئی تو ابو قیس کو سرخ اور زرد ریشمی کپڑے اور تبا پہنائی گئی۔ اسے ٹوپی بھی اڑھائی گئی جس پر خوبصورت کام بنا ہوا تھا اور طرح طرح سے سجائی گئی تھی۔

یہ ہے مطلب اس جیلے کا جو امام حسینؑ نے بڑید کے بارے میں لکھا تھا۔ یہی شخص خلیفہ بن گیا تھا اور اس نے امام حسینؑ پر داؤڈ الا تھا کہ اس کی بیعت کر لیں اور اسے اپنے نانا کا خلیفہ برحق تسلیم کر لیں۔ آئیے دیکھیں کہ امامؑ نے بیعت کیوں منظور نہیں کی اور شہادت کیوں قبول کی۔

بعض مصنفین نے اس سوال کا بہت ہی غلط اور رکیک جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے اندازہ لگایا کہ چاہے بیعت کریں یا نہ کریں، بنی امیہ چھوڑیں گے نہیں اور ہر حال میں آپ کو قتل کر دیں گے۔ لہذا آپ نے سوچا کہ کیوں نہ آبرو مندانه طریقے سے قتل ہو جائیں اور اپنی جان خدا کی راہ میں دیدیں۔ یہ جواب بہت سطحی اور غیر تسلی بخش معلوم ہوتا ہے۔ گو یا جب امامؑ نے دیکھا کہ قتل تو ہونا ہی ہے تو جان پر کھیل گئے۔ بقول شخصے تیل کر گیا تھا کہہ دیا کہ حضرت عباسؑ کی نذر



امامؑ نے بھی جب دیکھا کہ مجھے قتل تو ہونا ہی ہے تو سوچا کہ بہتر ہے کہ میں عزت کے ساتھ قتل ہو جاؤں اور اسلام کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔

بات یہ نہیں ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس زمانے میں ملتِ اسلامیہ کی جو حالت تھی اس کا بنظرِ فاعلِ مطالعہ کیا جائے اور خود امامؑ کے خطبات اور کلمات پر غور کیا جائے تاکہ حقیقتِ حال روشن ہو جائے۔

امام حسینؑ نے ان تمام اسباب پر غور کرنے کے بعد جو پچھلے تیس سال سے پیش آ رہے تھے یہ طے کیا اور صحیح طے کیا کہ اس وقت یعنی ۶۰ھ میں ملتِ اسلامیہ کی کجی اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ اس کا بلوا محض نصیحتوں، تقریروں، خطبوں، دینی اور مذہبی مقالوں اور مراسلوں سے نہیں ہو سکتا، نہ ان باتوں سے امت کو راہِ راست پر لانا ممکن ہے۔ اگر معمولی کجی ہوتی تو ممکن تھا کہ معمولی تحریک یا معمولی اقدام سے اُسے دُور کیا جاسکتا اور متحرکین راہِ راست پر آجاتے لیکن کجی انہی غیر معمولی اور شدید تھی کہ اس کا اثر بنیادی اصولوں پر پڑ رہا تھا۔ پھر کسی ایک شخص کی اصلاح کا معاملہ نہیں تھا کہ چھوٹی سی تحریک اور پسند و نصیحت سے کام بن جاتا۔ فساد پورے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اس لیے امام حسینؑ نے طے کیا کہ غیر معمولی انقلابی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ اب تک اس سلسلے میں امیر المؤمنینؑ اور امام حسنؑ نے جو ابتدائی کام کیا ہے اس سے قطعی اور حتمی نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ خود امام حسینؑ سے بہتر اس تحریک کے اسباب کون بیان کر سکتا ہے اور انھوں نے یہ اسباب بیان بھی کیسے ہیں۔ آئیے آپ کے خطبات اور کلمات کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ امامؑ خود کیا فرماتے ہیں، بات کہاں سے شروع کرتے اور کہاں پر ختم کرتے ہیں:

امامؑ کی تقریروں اور تقریروں سے خصوصاً اگر ان کی تاریخی ترتیب کو ملحوظ

رکھا جائے تو مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں آپ نے اپنی تحریک کے راز پر سے پردہ نہیں اٹھایا تھا لیکن جوں جوں مقصد کی طرف پیش قدمی ہوتی گئی، آپ نے تحریک کے اسباب و علل سے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس وصیت نامے سے لیکر جو آپ نے مدینہ میں اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھ کر دیا تھا، اس آخری خطبے تک جو منزل بیضہ میں حرمین یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کے سامنے دیا، آپ نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو بتلادیا کہ آپ نے یہ قدم کیوں اٹھایا اور یہ کہ آپ کے سامنے اسکے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ جو رخصتہ کہ اولاً خلافت اسلامی میں اور تانیا مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی میں پڑ گیا تھا، اس کا شہادت کے سوا کوئی علاج نہ تھا۔

جب عامل مدینہ نے بیعت کے لیے آپ پر دباؤ والا آپ مسلسل دو رات خاتم الانبیاء کی قبر پر جانے اور وہاں نماز پڑھنے پر ہے۔ دوسری رات قبر مطہر کی زیارت کرنے اور چند رکعت نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگتے ہوئے کہا:

اللَّهُمَّ هَذَا قَبْرُ نَبِيِّكَ وَأَنَا ابْنُ بَيْتِ نَبِيِّكَ  
وَقَدْ حَضَرْتَنِي مِنْ الْأَمْرِ مَا قَدْ عَلِمْتَ .

خدایا! یہ تیرے پیغمبر کی قبر ہے۔ میں ان کا نواسا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ مجھے کس صورت حال کا سامنا ہے۔

شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ امام کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ میری جان کے دیپے ہیں۔ میں چاہے ان کی بات مانوں یا نہ مانوں، یہ میرے قتل سے باز نہیں آئیں گے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ کوئی مسلمان اس فقرے کے یہ معنی نہیں لے گا کہ امام حسینؑ کو شہادت کا خطرہ تھا اور چونکہ وہ اس خطرے سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ مع اپنے بیوی بچوں کے سلامتی کے ساتھ زندگی

گزار سکیں اس لیے آپ بیتابی کا اظہار کر رہے تھے اور خدا سے کہہ رہے تھے کہ خدایا میں تیرے پیغمبر کا نواسا ہوں۔ کیا عجیب مطلب ہے! کیا خود پیغمبر کو قتل نہیں کیا گیا تھا؟ کیا خود انہیں زہر نہیں دیا گیا تھا؟ کیا امام علیؑ اور امام حسنؑ شہید نہیں ہوئے تھے؟ پھر شہادت پر بے حدیثی کیوں؟ مارے جانے کی شکایت کیا؟ وہ مسلمان جو صرف چند سال یا بعض دفعہ چند ماہ رسول اللہ کے زیر تربیت رہے، باوجودیکہ پہلے مشرک اور بت پرست تھے، پھر بھی شہادت سے گھبراتے نہیں تھے، بلکہ گھر سے نکلے ہوئے دعا کرتے تھے کہ زندہ سلامت واپس نہ آئیں اور راہِ خدا میں شہادت کی سعادت حاصل کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرزندِ رسولؐ پروردہ علیؑ درمنزل شہادت سے گھبرائے اور خدا و رسولؐ سے ملتی ہو کہ کسی طرح اس بلا کو ٹالیں اور مجھے زندہ رہنے کا موقع دیں۔

عمرو بن جموح جو بدینہ کے رہنے والے تھے، پہلے بت پرست تھے اور بدینہ میں ایک مندر کے مہنت تھے۔ یہ بت پرستی پر ثابت قدم رہے اور بدینہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد بھی بت پرستی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ خلوص دل سے اپنے گھر میں ایک بت کی پوجا کرتے رہے کئی دن تک ایسا ہوتا رہا کہ رات کو بنی سلمہ کے چند نوجوان ان کا بت چرا لیتے اور اسے کسی کنویں یا گندی نالی میں پھینک دیتے۔ صبح کو یہ بڑھے بیچارے اپنے دیوتا کی تلاش میں نکلتے، اسے گندگی سے نکالتے، دھوتے، صاف کرتے، خوشبو لگاتے اور پھر بڑی عاجزی سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر معتذرتے اور کہتے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کون تیرے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے تو میں اس سے منٹ لیتا مگر یقین کر کہ مجھے معلوم نہیں اس لیے مجبوری ہے۔ بنی سلمہ کے نوجوان برابر اپنے کام میں لگے رہے۔ آخر ایک دن عمرو بن جموح کی سوئی ہوئی فطرت بیدار ہو گئی

اور انھوں نے اپنے دیوتا سے جسے لوگوں نے مرے ہوئے کتے کے ساتھ رسی سے باندھ کر کنویں میں پھینک دیا تھا، کہا کہ اگر تو واقعی دیوتا ہوتا تو کتے کے ساتھ کنویں میں نہ ہوتا۔ یہ کہہ کر دل شکستہ و افسردہ خاطر گھر لوٹ آئے، بت پرستی چھوڑ دی اور شاید اسی دن اسلام لے آئے۔

یہ صاحب پہلے بت پرست تھے لیکن جب مسلمان ہوئے تو چند سال کی اسلامی تربیت سے ان کی روح کی رفعت اور نیالآت کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ جب شوال ۳؎ میں جنگ اُحد کی تیاری ہونے لگی تو ان کے چار بیٹے پہلے ہی رسولِ خدا کی ہمراہی پر آمادہ تھے۔ انہوں نے اور دوسرے متعلقین نے اصرار کیا کہ آپ بڑھے آدمی ہیں، پاؤں میں بھی لنگ ہے، آپ تکلیف نہ اٹھائیں، گھر ہی میں رہیں۔ آپ کے چار بیٹے پہلے ہی رسولِ خدا کی ہمراہی میں اس جہاد میں شرکت کر رہے ہیں۔ عمر و اس تجویز پر بہت اشفقتہ ہوئے۔ رسولِ خدا کا دم ن پکڑ لیا اور کہا مجھے جنت میں جاتے دیجیے، میں ننگڑا ہی چلا جاؤں گا۔ جب گھر سے چلے تو شوق شہادت میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا:

”اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي الشَّهَادَةَ، اللَّهُمَّ لَا تَرُدَّنِي إِلَى أَهْلِي“

بارِالہا! مجھے شہادت سے محروم نہ رکھ، خدایا! میری آرزو ہے کہ اب میں گھر واپس نہ آؤں۔

مقام فکر یہ ہے کہ اگر ایک عام مسلمان جس کی گزشتہ ساری عمر بت پرستی میں گزری ہو اور آخر میں اپنے قبیلے کے جوانوں کے دباؤ سے مسلمان ہوا ہو، اسے اسلام اس روحانی بلندی پر پہنچا سکتا ہے کہ وہ میدانِ جہاد سے صحیح سلامت اپنے بیوی بچوں کے پاس آنا محرومیت اور کم نصیبی سمجھنے لگتا ہے اور صدقِ دل سے یہ چاہتا ہے کہ

دوبارہ گھر نہ لٹے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ جو زیدۃ المکارم والفضائل خلاصتہ شخصیت ختم المرسلینؑ و امیر المؤمنینؑ ہیں، وہ موت سے گھبر کر نالہ و فریاد کریں اور دامنِ رسولؐ پکڑ کر التجا کریں کہ یا رسول اللہ! لوگ مجھے مارے ڈالتے ہیں، میری فریاد کو پہنچے۔ درحقیقت یہ بات ہرگز نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور نہ اس جملے کا کہ ”مجھے معلوم ہے کہ مجھے کس صورتِ حال کا سامنا ہے“ یہ مطلب سمجھنا چاہیے۔ اس طرح تو ان کی زندہ جاوید تحریک کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور وہ سسطی اور مبتذل معلوم ہونے لگتی ہے۔ آپ نے اللہ سے مناجات کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ خدایا جو صورتِ حال ہے مجھے معلوم ہے۔

صورتِ حال سے مراد وہ حالات ہیں جن کی آپ نے اپنے خطیبوں، مسلمانوں اور مکالموں میں وضاحت کی ہے، حالات کا وہ اندازہ ہے جو آپ نے لکایا تھا۔ صورتِ حال سے مراد وہ افسوسناک حالت تھی جن سے مسلمان اس زمانے میں دوچار تھے۔ صورتِ حال سے مراد خلافتِ بنی امیہ کے وہ واقعات تھے جن کے گہرے جائزے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قربانی اور شہادت کے بغیر مسلمانوں کو گمراہی سے نجات نہیں دلائی جاسکتی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا تھا: خدایا میں نیکیوں کو پسند کرتا ہوں اور برائیوں سے بیزار ہوں۔ یہ کہہ کر امامؑ نے قدرے اپنے مقصد کی وضاحت کر دی تھی لیکن ابھی یہ مقصد پوری صراحت سے بیان نہیں کیا تھا کہ عوام بھی سمجھ جائیں۔

پھر آپ نے فرمایا تھا: اے ذوالجلال والاکرام! میں اس قبر اور صاحبِ قبر کے واسطے سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے وہ راہ دکھا جس میں تیری اور تیرے رسولؐ کی رضا ہو، جس پر چلنے سے تو بھی خوش اور تیرا رسولؐ بھی خوش ہو۔

## امام کا قیام امر بالمعروف

### اور نہی عن المنکر کی خاطر تھا

امام حسینؑ نے اس گفتگو میں اور اپنے وصیت نامے میں ابھی صرف یہ بات عیاں کی تھی کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جا رہا ہوں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے امام کی کیا مراد تھی؟ شاید بہت سے لوگ جنھوں نے امامؑ کے یہ الفاظ سنے ہوں، یہ سمجھے ہوں کہ امامؑ یہ چاہتے ہیں کہ کوفہ جا کر وہاں کے بقاول اور نانبائیوں سے یہ کہیں کہ کم مت آلو، مٹرا ہوا دہی اور خراب پنیر کاہلوں کو مت دو، کچی اور جلی ہوئی روٹی مت بنو، پھوپھا کوفہ کے تاجروں سے کہیں کہ سود مت لو۔ یہ تو ہے نہی عن المنکر۔ ساتھ ہی جو انان کوفہ سے یہ کہیں کہ واجب نماز سے غفلت نہ کرو۔ اگر تمھارے پاس روپیہ ہو تو حج کے لیے ضرور جاؤ۔ یہ ہوا امر بالمعروف۔

لیکن اصل میں معاملہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ اس قسم کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اچھا اور ضروری کام سہی لیکن یہ کام تو کوفہ کے معمولی علماء بھی انجام دے سکتے تھے۔ اس کے لیے امامؑ کے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ بات دراصل یہ ہے کہ امام حسینؑ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت کے حالات میں صرف ان ہی کی شخصیت تھی جو ایسا اقدام کر سکتی تھی جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے، مردِ زمانہ کا اس پر اثر نہ ہو سکے اور تاریخ اسلام میں اس کو بھلا یا نہ جاسکے۔

امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو کر ۳۰ شعبان کو مکہ میں داخل ہوئے اور وسط

رمضان میں اپنے عم زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ رمضان کے باقی دنوں میں اور شوال، ذی قعد اور آٹھویں ذی الحجہ تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فرزندِ رسولؐ خدا اور فرزندِ مکہ و متنی آٹھویں ذی الحجہ کو جب لوگ احرام باندھ رہے تھے، مناسکِ حج ادا کیے بغیر محض عمرہ کر کے مکہ سے باہر چلے جائیں گے مگر انھوں نے روانگی کا عزم کر لیا تھا۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور احرام کھول دیا اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں انھیں حرم مکہ ہی میں گرفتار یا قتل نہ کر دیا جائے۔ اس طرح قتل ہونے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ امام نے قتل سے بچنے کے لیے مکہ نہیں چھوڑا بلکہ وہ اس لیے مکہ سے روانہ ہو گئے تاکہ اگر قتل ہوں تو اس طرح قتل ہوں کہ ان کی شہادت سے رستی دنیا تک اسلام کو فائدہ پہنچے۔

لہوف کی روایت ہے کہ روانگی سے قبل آپ نے مجمع میں خطبہ دیا جس میں

حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

”حَطِّ الْمَوْتِ عَلَىٰ وُلْدِ آدَمَ مَخْطِ الْقَلَادَةِ عَلَىٰ

حَبِيْبِ الْفِتَاةِ“

موت نے بنی آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے جیسے کسی جوان

عورت کی گردن پر گلوبند کا نشان پڑ جاتا ہے، مطلب یہ کہ موت بنی آدم

کے لیے ناگزیر ہے۔

یہاں آپ نے بات کو زیادہ واضح کر دیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات

کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ موت اور شہادت کی بات کی اور یہ بتا دیا کہ اس

وقت یعنی سنہ ۶ ہجری میں معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ اس کی اصلاح مالی یا زبانی

کوششوں سے ہو سکے۔ خود امام حسینؑ کے مواعظ بھی اب بے اثر تھے۔ آپ نے یہ کہہ کر کہ موت نے بنی آدم کو نشان زدہ کر دیا ہے یہ واضح کر دیا کہ جو دینی واجتماعی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، اب شہادت ہی اس کی اصلاح کی واحد صورت ہے اور شہادت بھی کسی ایسے شخص کی جو ترزادہ رسولؐ ہو۔ اس خطبے میں بھی جو آپ نے مکہ سے واپسی سے قبل دیا تھا، بات صرف شہادت کی ہے، موت کی ہے اور رسولؐ خدا اور اپنے والدین کے پاس جانے کی ہے، کربلا کے بھوکے بیٹروں کے تجنب میں پھیننے کی ہے۔ پھر بھی یہ تذکرہ نہیں کیا کہ اس سفر کا یہی انجام ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ خطبہ آپ نے آٹھویں ذی الحجہ سے پہلے شاید ساتویں ذی الحجہ کو مسجد الحرام میں حجاج اور زائرین کعبہ کے مجمع میں دیا تھا۔ اس وقت بظاہر حالات امامؑ کے حتیٰ میں تھے اور اکثر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جلد ہی یزید بن معاویہ کا زوال ہو جائے گا اور خلافت اس کے صحیح حقدار یعنی امام حسینؑ کو مل جائے گی کیونکہ مسلم بن عقیل اطلاع دے چکے تھے کہ سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے سوا کسی کو امامت و خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے اور کسی دوسرے کو بطور حاکم قبول نہیں کرتے اس لیے جلد سے جلد آئیے۔ بظاہر حالات بڑے اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھے لیکن پھر بھی امامؑ شہادت کی بات کر رہے تھے اور عراقی بیٹروں کی درندگی کا تذکرہ کر رہے تھے۔

بات وہی ہے جو ہم پہلے کہ چکے ہیں کہ امام حسینؑ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی شہادت کے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اس لیے آپ نے کہا کہ موت ناگزیر ہے اور بند موت بشر کے گلوگیر ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:



”جس طرح یعقوبؑ اپنے فرزند یوسفؑ سے ملنے کے مشتاق تھے اسی طرح میں بھی اپنے اسلاف یعنی رسول اللہؐ، علیؑ، حمزہؑ، جعفرؑ اور اپنی ماں فاطمہ زہراؑ کے دیدار کا مشتاق ہوں۔ میرے لیے شہادت گاہ تجویز ہو چکی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسینؑ بن علیؑ کی ذاتی تجویز نہیں تھی بلکہ من جاتب اللہ تھی۔ خدائے بزرگ و برتر نے ازل سے ہی مقدر فرمادیا تھا کہ امت میں ایسا فساد رونما ہوگا اور حسینؑ جان کی بازی لگا کر شہید ہوں گے۔ پھر فرمایا:

”میں دیکھ رہا ہوں گویا بیابانی بھیڑیے نواولیں اور کربلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے کوچ رہے ہیں۔ وہ اپنے بھوکے پیٹ اور خالی زنبیلیں بھر رہے ہیں وہ اپنی زنبیلیں اور اپنے پیٹ بھرنے کے لیے موجود ہیں اور میں اس سماجی اور دینی بگاڑ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے موجود ہوں، جو مقدر میں ہے اس سے کوئی مفر نہیں۔ یہ تجویز اللہ کی طرف سے ہے اور اس نے موجودہ حالات کی اصلاح کا ذریعہ میری شہادت کو قرار دیا ہے۔ ہم اہلبیتؑ کی توحشی دہی ہے جو اللہ کی رضا ہے۔ اس کی طرف سے جو مصیبت بھی آئے ہم اس پر صبر کرتے ہیں۔ وہ ہمیں صابروں کا پورا اجر دیتا ہے۔ ہم حکم گوشتہ رسولؐ ہیں، رسولؐ سے الگ نہیں ہو سکتے، ہمشت بریں میں ہم رسولؐ کے ساتھ ہوں گے تاکہ ہمیں دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور آپؐ وہ وعدے پورے کریں جو آپؐ نے ہم سے کیے ہیں۔ جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو صرف

وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں انشاء اللہ کل صبح روانہ ہو رہا ہوں۔“

اللہ کے دین، حقوق الناس اور اسلامی سوسائٹی کے دفاع کے لیے مختلف اوقات میں مختلف تدبیر سے کام لینا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی وقت راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو۔ کسی وقت مفید اور نصیحت آمیز باتوں سے لوگوں کو راہِ راست پر لایا جاسکے۔ ممکن ہے کبھی تصنیف و تالیف سے اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو کام میں لاکر لوگوں کو حق کی طرف مائل کیا جائے اور ان کی دینی و اخلاقی تربیت کی جائے لیکن آخری جیلے میں امامؑ نے بتلادیا کہ آج وہ دن نہیں کہ مالی مدد، قلمی اعانت اور زبانی خیر خواہی سے اسلامی عقیدہ کا حل تلاش کیا جاسکے۔ اب وہ موقع ہے کہ شہادت بھارتی اور قربانی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس کے بغیر نہ فساد پر قابو پایا جاسکتا ہے، نہ حالات کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔ اب کوئی یہ نہ سوچے کہ امام حسینؑ جو راہِ خدا میں قدم بڑھانے کے لیے کمر رہے ہیں تو میں بھی کچھ چندہ دیدوں گا یا عبید اللہ بن جراح بنی امام کی دعوت کے جواب میں کہیں کہ میں بھی ایک اسپنیل بیکر دوغاپسند پیش کر دوں گا یا کوئی اور صاحب فرمائیں کہ میں پانچ تلواریں، سات زرہیں اور چار نیزے نذر امامؑ کر دوں گا۔ آج حسین بن علیؑ کو تلوار چاہیے نہ نیزہ، گھوڑا چاہیے نہ روپیہ۔ ہاں کوئی خلوص نیت سے جان کا ہدیہ پیش کرے تو قبول ہے۔ جو کوئی راہِ خدا میں جان دینے پر آمادہ ہو، جو خدا سے ملاقات کا متمنی ہو وہ امامؑ کا ہم سفر ہو جائے۔ انشاء اللہ کل صبح روانگی ہوگی۔

حیرت ہے کہ اس قدر پر زور تاکید کے باوجود بہت سے کم نصیب موقع پرست بھی سازگار حالات کے دھوکے میں امامؑ کے ساتھ ہو لیے اور شایدان میں سے بیشتر مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر پلٹنے تک ساتھ رہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ

شروع ہی سے یہ لوگ ایسے امام کے ساتھی تھے جو غلبہ بنے اور برسرِ اقتدار آئے۔ وہ ایسے امام کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھے جو جان دینے اور شہادت پانے جا رہا ہو، جس کا پانی بند کیا جانے والا ہو اور جس کے ساتھی شہادت کا اعزاز حاصل کرنے والے ہوں۔

### حضرت سید الشہداء کے مناقب

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ ابن اثیر کی مشہور کتاب اُسد الغابہ سے امام حسینؑ کے بارے میں چند حدیثیں نقل کر دی جائیں اور اس کے بعد سابقہ مضمون کو جاری رکھا جائے۔

ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ اگر مجھ کا خون آدمی کے کپڑے کو لگ جائے تو کیا ہو؟ عبداللہ بن عمر نے کہا: دیکھو! یہ عراقی مجھ کے خون کے بارے میں پوچھ رہا ہے اور حالت یہ ہے کہ انہی عراقیوں نے فرزندِ رسولؐ خدا کو قتل کر دیا۔ میں نے خود رسولؐ خدا کو یہ کہتے سنا ہے۔ "الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ رِيحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا" یعنی حسنؑ اور حسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔

رسولؐ خدا کا ارشاد ہے:

"حُسَيْنٌ مِّمِّيْ وَ اَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، اَحَبُّ اِلَلّٰهِ مِنْ اَحَبِّ حُسَيْنًا، حُسَيْنٌ سَبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ"

یعنی حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے۔ جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔ حسینؑ پیغمبر زادہ ہے۔

انس بن حرث کا بی جو خود بھی صحابی تھے اور ان کے باپ بھی صحابی تھے،

کہا کرتے تھے کہ میں نے خود رسول اللہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا:  
 "إِنَّ ابْنَى (يَعْنَى الْحُسَيْنِ) يُقْتَلُ بِأَرْضِ مِنْ أَرْضِ  
 الْعِرَاقِ فَمَنْ أَدْرَكَهُ فَلْيَنْصُرْهُ."  
 میرا بیٹا حسینؑ سر زمین عراق پر قتل کیا جائے گا لہذا جو اس وقت  
 موجود ہو اسے چاہیے کہ اس کی مدد کرے۔

رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کے آثار رسالہ میں پیدا ہو گئے اور امامؑ  
 بھی شہادت کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس طرح نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں  
 کہ جب ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہ رہی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اگر وہ  
 اطاعت قبول کر لیتے ہیں تب بھی کسی نہ کسی بہانے قتل کر دیے جائیں گے تو  
 کوئی چارہ نہ ہونے اور زندہ رہنے کا کوئی امکان باقی نہ رہنے کی بنا پر شہید  
 ہونا قبول کر لیا۔ ایسی کوئی بات نہ تھی اور اگر کوئی شخص یہ بات کہے یا لکھے تو  
 اس کا قول ضعیف اور بے بنیاد ہے اور اگر واقعی یہی صورت ہوتی تو امامؑ کے  
 عمل کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جاتی اور دنیا اس مقدس تحریک کو کیوں اتنی اہمیت  
 دیتی۔ آپ کی تحریک ان تمام مقدس تحریکوں کا مرکزی نکتہ تھی جو اسلام کی  
 تاریخ میں اٹھیں چاہے آپ سے پہلے یا آپ کے بعد۔ جن تحریکوں کی رہنمائی  
 زید بن علی، حسین بن زید، صاحب نفس ذکیہ، انکے بھائی ابراہیم، حسین شہید فنج  
 اور دوسروں نے کی، وہ سب امام حسینؑ ہی کی تحریک کا تتمہ تھیں۔ یہ کیونکر  
 ممکن ہے کہ ایک ایسی تحریک کا تجربہ ان بے بنیاد توجیہات سے کیا جائے؟  
 اس بارے میں صحیح بات وہی ہے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے اور کس  
 ہے کہ رسالہ کے اواخر اور رسالہ کے اوائل میں امام حسینؑ نے محسوس کیا کہ

ملت اسلامی کا روحانی زوال اور اخلاقی بگاڑ اب اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ  
سوائے شہادت کے اصلاح امت کی کوئی اور صورت باقی نہیں رہی۔ ع  
تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کج کجا ہم

حقیقت یہ نہیں ہے کہ ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی اس لیے  
انہوں نے شہید ہونا قبول کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے زندہ رہنے اور امت  
اسلامی کی بقا کی اب ایک ہی صورت تھی اور وہ تھی خواتین انقلاب! آپ نے طے  
کیا کہ اگر ملت اسلامی کو زندہ رہنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ شَآءَ  
اَنْ يَّرَاكَ قَتِيْلًا کے مطابق آپ خود قتل ہو جائیں اور اِنَّ اللّٰهَ شَآءَ اَنْ  
يَّرَا هُنَّ سَبَايَا کے مطابق آپ کے عزیز، آپ کی بہنیں اور دنیا سے اسلام کے بہترین  
اور بزرگ ترین خطیب عراق اور شام جا کر ملت اسلامی کو اس کی زبوں حالی کی  
طرف توجہ دلا کر اسے مرگ و نابودی کے خطرے سے نجات دلائیں اور نہ صرف حسینؑ  
بن علیؑ سے پیشتر کی مقدس تحریکوں کی روح کو زندہ رکھیں بلکہ آئندہ کی دینی تحریکوں  
کے لیے بھی راہ ہموار کر دیں۔ ان خطیبوں کے نام یہ تھے: زینب بنت علیؑ، ام کلثومؑ  
بنت علیؑ، فاطمہ بنت الحسینؑ اور علی بن الحسینؑ۔

جب مدینہ کے گورنر ولید بن عقبہ نے خلیفہ کے حکم سے امامؑ پر دباؤ ڈالا کہ بیعت  
کر لیں اور ۲۸ رجب کی شب میں ولید کے گھر پہ وہ واقعہ پیش آیا جس میں امامؑ  
نے بیعت نہیں کی اور قطعی فیصلہ اگلے دن اور اس کے بعد سر ملتی رکھا تو اگلے ہی  
دن عبداللہ بن زبیر ڈور کے مارے مدینہ سے بھاگ نکلے مگر امامؑ اس دن بھی  
مدینہ ہی میں رہے۔ تازہ خبر کی جستجو میں گھر سے باہر نکلے تو گلی میں مروان بن حکم  
سے ٹھجھڑ ہو گئی۔ اس نے کہا کہ حضرت میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آپ میری

بات مابین اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح کریں۔ امامؑ نے فرمایا کہ کیا کہتے ہو؟ اگر میری بھلائی کی بات ہوگی تو ضرور مان لوں گا۔ مروان نے کہا میری راتے تو یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں۔ اس میں آپ کے دین اور دنیا دونوں کی بھلائی ہے مطلب یہ تھا کہ اگر آپ یزید کو بیعت خلیفہ اور امام، ملت اسلامی کا رہبر اور پیشوا تسلیم کر لیں تو آپ کا دین اور دنیا دونوں محفوظ، وگرنہ بیعت سے انکار کیا اور مخالفت اختیار کی تو دین بھی تباہ اور دنیا کا بھی نقصان، امامؑ نے مروان کی یہ جسارت امیر گفتگو سن کر یہ آیت پڑھی: "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِلَيْهِ رَاجِعُونَ" یہ آیت کسی مصیبت کے موقع پر کسی کو تسلی دینے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ امامؑ نے جس مصیبت کو یاد کر کے یہ آیت پڑھی وہ مسلمانوں کا فکری لگاڑ تھا یعنی ایک ناسلمان قوم صحیح راستے اور اپنی فکری روش سے یوں ہٹ جائے گی کہ کہا جائے گا کہ اگر حسینؑ بن علیؑ یزید کی بیعت کر لیں تو ان کا دین اور دنیا محفوظ ورنہ دونوں ضائع۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

”وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بَلَّيْتَ الْأَمَّةَ بِرَاعٍ  
مِثْلَ يَزِيدٍ، وَلَقَدْ سَمِعْتُ جَدِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ الْخِلَافَةُ مُحَرَّمَةٌ عَلَى  
أَلِ ابْنِ سَفِيَّانٍ“

”اگر یزید جیسا شخص اسلام کا محافظ اور مسلمانوں کا رہنما بن جائے تو پھر اسلام کا خدا ہی محافظ ہے۔ میں نے خود اپنے نانا رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خلافت آل ابوسفیان پر حرام ہے۔“  
اس پر امامؑ اور مروان کے درمیان بات بڑھ گئی اور آخر مروان پاؤں

پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بہر صورت امام مدینہ سے مکہ آ گئے۔ اٹھویں ذی الحجہ کو جسے یوم ترویہ بھی کہتے ہیں آپ عازم عراق ہوئے۔ اسی دن وہاں ہانی بن عروہؓ کو گرفتار کیا گیا تھا اور مسلم بن عقیل نے خردج کیا تھا۔ اس موقع پر بیشتر مسلمانوں کو مناسب حج چھوڑ کر امام کی روانگی پر بڑی حیرت ہوئی۔

**میں سکینہ**

**فرزدق کی امامؑ سے گفتگو** **حیدرآباد پبلسٹ ہاؤس نمبر ۸-۱۰۱**

فرزدق اس زمانے کا نامور شاعر تھا۔ اس کا نام اسلامی تاریخ میں مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستہ میں میں اپنی ماں کو حج کرانے لے گیا تھا۔ جب میں سرزمینِ تم پہنچا تو تین ماں کا اونٹ ہانک رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حسین بن علیؑ ہتھیار سجائے ہوئے مکہ سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کچھ اونٹ دیکھ کر پوچھا کہ یہ اونٹ کس کے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ حسین بن علیؑ کے ہیں۔ میں امامؑ کی ملاقات سے شرفیاب ہوا تو انھیں سلام کیا اور کہا کہ اللہ آپ کی آرزو میں برلائے۔ اے فرزندِ رسول! آپ نے اتنی عجلت کیوں کی کہ اعمالِ حج ادا کیے بغیر حرم سے جا رہے ہیں؟ آپ نے کہا کہ اگر عجلت نہ کرتا تو گرفتار ہو جاتا۔ اس وقت آپ نے پوچھا: تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ ایک عرب ہوں۔ بخدا اس سے زیادہ آپ نے میرے متعلق کوئی تحقیق نہیں کی۔ پھر آپ نے کہا کہ جہاں سے آرہے ہو وہاں (یعنی عراق) کے لوگوں کے متعلق بھی تمھیں کچھ معلوم ہے؟ میں نے کہا، آپ نے صحیح آدمی سے پوچھا۔ مجھے وہاں کے لوگوں کا حال خوب معلوم ہے۔ ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں آپ کے خلاف اباقی فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ انامؑ نے جواب دیا کہ ہاں یہ سچ ہے، وہی ہوتا ہے

جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اگر قضا و قدر کا فیصلہ وہ ہوا جو ہم چاہتے ہیں تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور شکر کی توفیق بھی اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر قضائے الہی نے ہمارا ساتھ نہ دیا تب بھی جس کی نیت نیک ہو اور باطن صاف ہو وہ کھائے میں نہیں رہتا۔ فرزدق نے کہا، اللہ آپ کی مراد برائے اور ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد فرزدق نے امام ۳ سے حج سے متعلق کچھ مسائل پوچھے اور جواب باثواب پا کر رخصت ہوا۔

قاری بن امام ۳ نے فرزدق سے جو کچھ فرمایا، ذرا اس پر پھر غور کیجئے۔ امام ۳ فرماتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی مقصد کے لیے کوشش کرتے ہیں اور کبھی ان کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ میرا مقصد ایسا ہے کہ چاہے کچھ بھی صورت کیوں نہ پیش آئے اور فتح و شکست کسی کی بھی ہو، میرا مقصد ضرور حاصل ہوگا۔ کوئی مال و دولت حاصل کرنے کی فکر میں ہے، کوئی کسب و تجارت کے لیے سرگرداں ہے۔ کوئی عزت اور مرتبہ کا متلاشی ہے۔ کوئی اپنی یا اپنے کسی بیمار عزیز کی صحت کے لیے ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس دوڑتا ہے۔ کوئی شہرت اور نیک نامی کی خاطر نیک یا بظاہر نیک کام کرتا ہے۔ یہ سب ممکن ہے کہ اپنا وہ مقصد حاصل کر سکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی تمام محنت اور کوشش رائیگاں چلی جائے کیونکہ آدمی کی ہر خواہش اور ہر آرزو پوری نہیں ہوتی۔

مَا كُلُّ مَا يَتَمَتَّى الْمَرْءُ يُذِرْكَهُ

بِحُورِي الرِّيَّاحِ بِمَا لَا تَسْتَهِي السُّفْنُ

یعنی آدمی جو چاہتا ہے، ہمیشہ وہی نہیں ہوتا۔ اکثر بادِ حوادث کے



تھپیڑے کشتی مراد کو اس کے راستے سے بھٹکا دیتے ہیں۔

اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ سب اپنے اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، کبھی شاہد مقصود سے ہم کنار ہو جاتے ہیں، کبھی ناکام ہتے ہیں اور کبھی تو اس کوشش میں جانِ عزیز تک گنوا بیٹھتے ہیں اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

امامؑ کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ آئندہ خواہ کچھ ہو اور عراق کی صورت حال کوئی بھی رخ اختیار کرے، میرے مقصد کی کامیابی یقینی ہے۔ میں ضرور اس فرض کی انجام دہی کے لیے اٹھا ہوں جو حالات موجودہ خدا کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے میرا مقصد یہ نہیں کہ خلیفہ بن جاؤں اور مسلمانوں پر حکومت کروں۔ اگر مجھے کامیابی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر دشمن سبقت لے جاتا ہے، تب بھی میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میری تحریک کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں واقعی مردانِ حق کا کوئی مادی محرک نہیں ہوتا۔ ان کا ہر جہاد اور ہر مقابلہ صرف خدا کے لیے اور ادائیگی فرض کی خاطر ہوتا ہے۔ ان کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ غالب آئیں یا مغلوب ہوں اور یہ تعبیر بھی نارسائی الفاظ کی وجہ سے ہے، ورنہ مردانِ حق کی لغت میں تو مغلوب کا لفظ ہی نہیں۔ یہی بات امامؑ نے عراق جاتے ہوئے فرزدق سے کہی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں کامیابی ہوئی تو ہم خدا کا شکر ادا کریں گے لیکن اگر تقدیر نے ہمارا ساتھ نہ دیا تب بھی چونکہ ہماری نیت نیک ہے ہم فنا نہیں ہوں گے۔ ممکن ہے قتل ہو جائیں لیکن مرے گئے نہیں کیونکہ راہِ حق میں شہید ہوجاتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جان دے دینے اور فنا ہو جانے میں بہت فرق ہے۔

یہی بات امام نے روزِ عاشورا ایک خطبے میں اہل کوفہ سے کہی تھی۔ آپ نے فروہ بن مسیک مرادی صحابی کے اشعار پڑھ کر اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر کچھ دوست یا دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ آج ہماری شکست اور نابودی کا دن ہے تو وہ سنت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج کا دن ہے جو زندگی جاوید کی تمہید ہے۔

ابن طاووس لکھتے ہیں کہ جب بربرین خنصیر ہمدانی کے وعظ و نصیحت کا لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو امامؑ خود اونٹ پر سوار ہوئے اور سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ جب سب خاموش ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو آپ نے بہ طرزِ شائستگی حمد و ثناء کی اور حجر پر، فرشتوں پر اور انبیاء پر درود بھیجا۔ پھر آپ نے فرمایا:

لوگو! افسوس ہے کہ تم نے ہمیں دھوکا دیا۔ تم نے خود فریاد کر کے ہمیں بلایا اور جب ہم تمہاری فریاد رسی کے لیے اٹھے تو تم نے وہی تلوار جو ہم نے تمہارے ہاتھ میں دی تھی ہمارے خلاف سونت لی اور وہی آگ جو ہم نے اپنے اور تمہارے مشترک دشمن کو نابود کرنے کے لیے روشن کی تھی تم نے ہمارے خلاف بھڑکادی اور دشمنوں سے مل کر دوستوں اور خیر خواہوں سے جنگ پر آمادہ ہو گئے حالانکہ نہ تمہارے ساتھ پہلے الصاف ہوا اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ تم اس وقت ہی قطعی فیصلہ کر لیتے اور ہمارا بیچھا چھوڑ دیتے جب ابھی تلواریں نیام ہیں تمہیں اور لوگ اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ تم اس وقت کیوں ٹٹری کے بیچوں کی طرح اڑنے اور پروانوں کی طرح منڈلانے لگے۔ تم پروردگار کو تمہارا تم نے قرآن کو چھوڑ دیا اور لگے اس کے کلمات میں رد و بدل کرنے۔ تم شیطان

کے ساتھی اور مصیبت کے طرفدار ہو۔ کیا تم ہمیں چھوڑ کر ظالموں کا ساتھ دو گے؟ تم ہمیشہ سے ہی بے وفا ہو۔ تمہارا گوشت پوست بے وفائی ہی کا پروردہ ہے۔ تم وہ میوہ ہو جو دوستوں اور خیر خواہوں کے کام نہیں آتا، ان کے گلے میں اٹکتا ہے اور دشمنوں کے گلے سے باسانی اتر جاتا ہے۔

دوستوں کے گلے میں اٹکنے سے مراد یہ ہے کہ تم یوں تو مدد کا وعدہ کرتے ہو اور جاں نثاری کا دم بھرتے ہو لیکن جب میدان کارزار میں امتحان کا وقت آتا ہے تو نہ صرف تمہارے وعدے ہی دھوکا اور فریب ثابت ہوتے ہیں بلکہ تم خود گلے میں بڑی ہنگر چھینس جاتے ہو کہ نہ اُگلے جائے نہ نگلی جائے۔

اس کے بعد ایام نے فرمایا:

”دیکھو اس ماور و خطا (ابن زیاد) نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم دو میں سے ایک راستہ اختیار کریں۔ یا تو نوار سونت کر میدان میں نکل آئیں یا ذلت و خواری قبول کر لیں تاکہ اسکا جو جی چاہے میرے ساتھ کرے لیکن ہم ہرگز ذلیل نہیں ہو سکتے۔ خدا، اس کے رسولؐ اور مردانِ با ایمان کو ہماری بے عزتی منظور نہیں ہو سکتی۔ ہم نے پاک اور باغیرت مہبتوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ یہیں شریفوں کی موت منظور ہے، کلبوں کی اطاعت قبول نہیں۔ اگرچہ میرے دوستوں اور مددگاروں کی تعداد کم ہے مگر میں انہی چند ساتھیوں کے ساتھ پیش قدمی کروں گا“

اس موقع پر امامؑ نے فروہ بن مسیک مرادی کے چند اشعار پڑھے جن کے ایک ایک لفظ سے روحانی عظمت و بلندی کی ایک دنیا آشکار ہے:

۱۔ اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں۔ کامیابی ہمیشہ ہی ہمارے قدم چومتی رہی ہے لیکن اگر ہم شکست سے بھی دوچار ہو جائیں تب بھی ہم کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔

۲۔ ہم بزدل نہیں ہیں لیکن اگر مقدر میں یہی ہو کہ ہمیں موت آئے اور دوسروں کو حکومت مل جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔

۳۔ موت کا یہی کاروبار جاری ہے، آج ایک کی کل دوسرے کی باری ہے۔  
۴۔ ہمارے سرداران قوم بھی ایسے ہی موت کا شکار ہوئے جیسے اگلے وقتوں کے لوگ۔

۵۔ اگر شاہانِ عالم کو زندگانی جاوید ملا کرتی تو ہم بھی کبھی نہ مرتے۔ اگر بڑے لوگ موت کے پنجے سے بچ سکتے تو ہم بھی بچ جاتے۔

۶۔ ہم پر ہنسنے والوں سے کہاد کہ ذرا ٹھہرو۔ تمہارا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

امامؑ ایمان و اخلاص اور عزمِ مصمم کی اس روح سے سرشار کہ سے عراق روانہ ہوئے۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور انجام کیا ہوگا مگر دوسروں کو حتیٰ کہ امامؑ کے عزیز و اقارب اور ارادتمندوں کو یہ پریشانی تھی کہ کہیں حالات نامساعد نہ ہو جائیں اور حالات ایسا رخ اختیار نہ کر لیں کہ آخر امامؑ شہید ہو جائیں۔ امامؑ خود تو شہادتِ ہی کے لیے جا رہے تھے مگر دوست اور وابستگانِ دامن یہ کہہ رہے تھے کہ حضور مت جائیے، خدا نخواستہ کہیں جان نہ چلی جائے۔

ان ہی میں امیر المؤمنینؑ کے بھتیجے اور داماد عبداللہ بن جعفر بھی تھے۔ امامؑ کی مکہ سے روانگی کے بعد اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ایک عرصہ دیکر بھیجا کہ امامؑ کی

خدرت میں پیش کر دیں، اس میں امام کو قسم دی گئی تھی کہ واپس تشریف لے آئیں۔ لکھا تھا کہ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں آپ اور آپ کے ہمراہی شہید نہ ہو جائیں۔ اگر آج آپ کی جان جاتی رہی تو دنیا اندھیر ہو جائے گی کیونکہ آپ ہی کی بدولت لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اور مومنین کی سب امیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں اس لیے جلد ہی نہ کیجیے، عریضے کے پیچھے میں خود آ رہا ہوں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن جعفر، والی مکہ کے بھائی کی محبت میں جو اپنے بھائی عمرو بن سعید کا خط لے کر آئے تھے، روانہ ہوئے۔ اس خط میں عہد و پیمان کے ذریعے امام کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ وہ آسودہ خاطر مکہ لوٹ آئیں۔ دونوں امام کی خدمت میں پہنچے اور خط پیش کیا۔ واپسی کے لیے اصرار کرتے رہے۔ امام نے جواب میں کہا کہ میں نے اپنے نانا رسول خدا کو خواب میں دیکھا ہے اور آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہ راستہ اختیار کروں۔ انھوں نے پوچھا آپ نے کیا خواب دیکھا ہے؟ امام نے کہا میں اپنا خواب تو زندگی بھر کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ عبد اللہ بن جعفر باؤس ہو کر لوٹ آئے البتہ اپنے بیٹوں عون اور محمد کو ہدایت کی کہ امام کی خدمت میں رہیں اور ان کے ساتھ عراق جائیں۔ یہ دونوں روز عاشورا شہید ہوئے۔

امام نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ کوفہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہاں سے آپ نے اہل کوفہ کو ایک خط لکھا اور قیس بن مسر کے ہاتھ بھیج دیا۔ ابھی تک مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر آپ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس خط میں آپ نے لکھا کہ مسلم بن عقیل کا خط مجھے مل گیا ہے۔ تمہاری بیعت، خلوص اور راہِ حق میں ہماری امداد کے عزم سے آگاہی ہوئی۔ خدا کرے تم ہمارے ساتھ نیکی سے دریغ نہ کرو اور اللہ تمہیں اس خلوص اور عزم کا اجر عظیم عطا کرے۔ میں آٹھویں ذی الحجہ

بروز ترفیہ مکہ سے روانہ ہو چکا ہوں۔ فرستادہ کے کوفہ پہنچنے پر پہلے سے بھی زیادہ حصول مقصد کے لیے کوشش شروع کر دو۔ خدا نے چاہا تو میں بھی چند ہی روز میں پہنچ رہا ہوں۔

قیس، امام کا خط لیکر روانہ ہو گئے لیکن کوفہ کے قریب ہی گرفتار ہو گئے۔ انہیں ابن زیاد کے روبرو لایا گیا۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ منبر پر چڑھ کر حسین بن علیؑ کو گالیاں دو۔ قیس منبر پر گئے۔ حمد و ثنا کے بعد کہا۔ اے لوگو! سمجھ لو کہ حسین بن علیؑ بہترین خلائق اور دخترا رسولؐ کا فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انہی کا بھیجا ہوا ہوں۔ تم سب ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ پھر عبید اللہ اور اس کے باپ پر لعنت اور علیؑ بن ابی طالبؑ پر درود بھیجا۔ عبید اللہ نے حکم دیا کہ انھیں چھت پر سے نیچے پھینک دیا جائے تاکہ ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں۔

امامؑ کوفہ کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ منزل زرد میں مسلم اور ہانی کی شہادت کی خبر ملی۔ آپ نے خبر سن کر فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہا باران دونوں پر رحمت کی دعا کرتے رہے۔ اُذِیْبُ الْحِجَابَاتِ کے پڑاؤ پر پہنچ کر قیس بن مسہر کی شہادت کی اطلاع ملی۔ آپ نے ان کے لیے بھی دعائے مغفرت کی۔ زبالہ کے پڑاؤ پر پہنچ کر آپ نے اپنے ہمراہیوں کو مسلم اور ہانی کی شہادت اور کوفہ کے حالات سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ ہمارے متوقع حامیوں نے ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اب جس کا دل چاہے اپنی راہ لے۔ یہ موقع تھا کہ امامؑ کے اکثر ہمراہی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ صرف عتوڑے سے باقی رہ گئے۔ مشہور مورخ، مفسر اور فقیہ محمد بن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الامم و الملوک میں بیان کیا ہے کہ امامؑ نے منزل ذی حسم میں خطبہ دیا اور مختصر تقریر کی۔ اس میں آپ

نے اپنے قیام کا محرک زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا اور شہادت کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا:

”تم دیکھ رہے ہو کہ حالات کیا ہیں۔ دنیا بالکل بدل گئی ہے اس نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ یہ مہری کا آغاز ہو گیا ہے اور وقت تیزی سے گزر رہا ہے صرف زندگی کی تلچھٹ باقی رہ گئی ہے۔ دنیا ایسی چراگاہ بن گئی ہے جس میں سولتے بیمار گھاس کے کچھ نہیں“

امام نے اس وقت کے حالات کو براہ کیوں قرار دیا۔ آپ کو کس بات کی شکایت اور افسوس تھا؟ پیراز آپ نے اگلے جملے میں بیان کیا۔ زندگی کی گراں باری خشک سالی یا امن و راحت کے فقدان کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی بات تھی جس نے زندگی کو تلخ اور ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ ذرا غور کیجئے، یہ وہ وقت تھا کہ دشمن کا ہراول دستہ پہنچ گیا تھا اور خطرہ تھا کہ امام کو عراقی لشکر گھیرے میں نہ لے لے یوگ یہی سوچتے تھے کہ کاشش امام یہ کام نہ کرتے اور تنہا اس راہ میں قدم نہ رکھتے بشاید کچھ کو تاہ نظریہ بھی حیا ل کر رہے ہوں کہ امام بھی یہی سوچ رہے ہوں گے اور اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے اس لیے ضروری تھا کہ امام کسی حد تک اپنے قیام کی غایت پر سے پردہ اٹھائیں اور واضح کریں کہ وہ کیا چیز ہے جو انہیں سخت ناپسند ہے اور جس نے ان کا جینا دشوار کر دیا ہے۔

اسی لیے انھوں نے اس مختصر خطبے میں مندرجہ بالا الفاظ کے بعد یہ کہا:

کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟ دراصل آپ ان لوگوں کو جواب دے رہے تھے جو کہتے تھے کہ آپ بیعت کیوں نہیں کر لیتے، موجودہ اسلامی حکومت کو باضابطہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟

فرزند زادۃ الیوسفیان کو اسلامی دنیا کا قائد اور امام کیوں نہیں مان لیتے؟  
 آپ نے فرمایا: کیا تم مسلمانوں کی موجودہ حالت نہیں دیکھتے؟ یہ نہیں دیکھتے  
 کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ امامت و خلافت کی بنیاد پیروی رسولؐ  
 پر نہیں رہی، مسلمانوں کی رہبری و پیشوائی کا مدار اب حق و انصاف کی بجائے  
 ظلم اور ترویجِ ظلم پر ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

ان حالات میں مومن کو لقمے پروردگار کا آرزو مند ہونا چاہیے۔ میں موت  
 کو کامیابی اور ظلم کے ماحول میں زندگی کو تکلیف دہ سمجھتا ہوں۔ مسجد الحرام کے خطبے میں  
 بھی مرگ و شہادت کی بات تھی، ساتھ ہی جہاں بازمی و قداکاری کا تذکرہ تھا۔  
 اس مرتبہ بھی شہادت کی بات ہے ساتھ ہی زندگی سے دل سردی اور فرسردگی بھی۔ آپ نے  
 فرمایا کہ ظالموں کے ساتھ زندگی کا نتیجہ سوائے تکلیف اور رنج کے کچھ نہیں۔ جو کچھ  
 امامؑ نے اس موقع پر اجمالاً بیان کیا۔ اس کی وضاحت حرمین یزید سے ملاقات میں کی۔

### امامؑ عالی مقام کا خطبہ

حرمین یزید ریاحی ایک ہزار سواروں کے دستے کے ساتھ امامؑ کو گرفتار کرنے  
 کو ذمہ سے آئے تھے۔ پہلی محرم ۱۱۰ھ کو حرہ اور ان کے ساتھیوں سے امامؑ کا سامنا ہوا۔  
 آپ نے انہیں پانی پلویا۔ جب تلہ کا وقت ہوا تو حجاج بن مسروق جعفی نے جو شہداء  
 عاشوراء میں سے ہیں، امامؑ کے حکم سے اذان دی۔ امامؑ نیچے سے باہر آئے اور  
 اذان و اقامت کے درمیانی عرصے میں ان سے گفتگو کی۔ آپ نے حد و ثنا  
 کے بعد کہا:



”لوگو! میں تمہارے پاس اس وقت آیا ہوں جب تم نے مجھے خطوط دکھے اور میرے بلائے کے لیے ایلچی بھیجے اور کہا کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ آپ آئیے، شاید آپ کے وسیلے سے اللہ ہمیں حق اور ہدایت پر مجتمع کر دے۔ اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آگیا ہوں، تم مجھ سے ایسا عہد و پیمانہ کرو جس سے مجھے اطمینان ہو جائے اگر تم ایسا نہیں کرتے اور تمہیں میرا آپسند نہیں تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاتا ہوں“

یہ سن کر سب لوگ چپ ہو گئے۔ کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ حجاج نے امامؑ کے حکم سے نماز کے لیے اقامت کہی۔ دونوں طرف کی فوج نے امامؑ کے پیچھے نماز باجماعت ادا کی۔ کچھ دیر آرام کے بعد جب عصر کا وقت ہوا تو عصر کی نماز بھی اسی طرح جماعت سے پڑھی۔ نماز کے بعد امامؑ نے پھر ایک بار اصحابِ حُر سے گفتگو کی اور کہا:

”لوگو! اگر تم خدا سے ڈرتے ہو اور حقدار کا حق پہچانتے ہو تو اللہ تم سے خوش ہوگا۔ ہم اہل بیتِ محمدؐ امامت و خلافت کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو آج اس کے ناحق دعویدار بنے ہوئے ہیں اور تم پر ظلم توڑ رہے ہیں لیکن اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے، ہمارے حق کا اعتراف نہیں کرتے اور اس وقت سے جب تم نے خط لکھے تھے اور قاصد بھیجے تھے، تمہاری رائے بدل گئی ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں“

حق سے امامؑ کی مراد یہ نہیں تھی کہ مثلاً اپنی عمارت بناتے وقت ہمسائے

کی دیوار نہ گراؤ یا دوسرے کو دھکا دیکر بس میں نہ چڑھو۔ امامؑ کی مراد وہ حق ہے جس پر تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ اگر وہ حق محفوظ ہے تو تمام حقوق محفوظ ہیں۔ اگر وہ حق ضائع ہو گیا تو تمام حقوق پامال ہو جائیں گے یعنی امامت اور مسلمانوں کی بہتری کا حق۔

حزبن زبیر باحی نے جواب میں عرض کی کہ بخدا مجھے ان خطوط اور قاصدوں کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ امامؑ نے عقبہ بن سمان سے جو روزِ عاشورا امیر ہوئے اور بعد میں رہا کر دیے گئے، فرمایا کہ اہل کوفہ کے خطوط ان کے سامنے رکھ دو۔ پھر بھی حمرنے کہا ہم نے کوئی خط نہیں لکھا اور ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ امامؑ نے فرمایا: موت سے پہلے تو یہ ممکن نہیں۔ امامؑ اپنے اصحاب کے ساتھ اور حُرّ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سوار ہوئے اور ایک ایسے راستے پر ہو لیے جو نہ مدینہ جاتا تھا اور نہ کوفہ۔ اسی اثناء میں حمرنے اپنے خیال میں بغرض خیر خواہی و نصیحت امامؑ سے کہا کہ آپ کو خدا کی قسم آپ جنگ نہ کیجیے ورنہ آپ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ امامؑ نے برا فرودختہ ہو کر کہا، کیا تم مجھے موت کی دھمکی دے رہے ہو؟ کیا میرے مارے جانے سے تمہیں چین آجائے گا؟ میرا جواب وہی ہے جو اس مردِ اوسنی نے دیا تھا جو رسولِ خدا کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا، اس کے چچا زاد بھائی نے اسے ڈرایا کہ کہاں جا رہے ہو مارے جاؤ گے۔ اسی نے جواب میں کہا:

”میں ضرور جاؤں گا۔ حق کے لیے جہاد کرتے ہوئے جان دینا اچھے لوگوں کا ساتھ دینا اور کم مایہ اور مجرموں سے دور رہنا کوئی شرم کی بات نہیں۔ اگر میں زندہ رہا تو مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہوگی اور اگر مر گیا تو کوئی الزام نہیں دے سکے گا۔ ذلت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی زندہ رہے اور بے بسی کی زندگی گزارے“

امام حسینؑ اور حر بن یزید ریاحی اپنے اپنے ساتھیوں سمیت منزلِ بیضہ پہنچے۔ یہاں بھی امامؑ نے ان سے گفتگو کی اور واضح کیا کہ میرا کچھ فرض ہے جس کی انجام آوری ضروری ہے، اس کے علاوہ میرا کوئی خیال نہیں۔ یہاں آپ نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ ہے: یزید ایک ظالم و جابر خلیفہ ہے۔ جن باتوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے وہ انہیں حلال سمجھتا ہے۔ خدا کے عہد کو توڑتا ہے اور سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ بندگانِ خدا پر ظلم روا رکھتا ہے۔ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ ایسے خلیفہ کو جو باز رکھنے کی کوشش نہیں کرے گا اس کا سشر بھی اس خلیفہ کے ساتھ ہوگا۔

اسی مضمون کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

”وَجَعَلْنَاهُمْ أَيْمَةً يَدْعُونَ إِلَى الْفِتْرِ“

”ہم نے ان میں سے کچھ پیشوا اور امام ایسے بنائے ہیں جو اپنے پیروکاروں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔“

یعنی سب پیشوا اور رہبر اپنے پیروکاروں کو بہشت کی طرف نہیں لے جاتے۔ کچھ رہبر تو ایسے ہیں جو اپنی قوم کی واقعی رہبری کرتے ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کی سعادت، خوش نختی اور اوج و ترقی کا باعث بنتے ہیں لیکن تجربہ بتلاتا ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ کچھ رہبر درحقیقت رہن ہیں۔ یہ وہ امام ہیں جو اپنے ماسوئین کو آتش دوزخ اور دنیا و آخرت کی حتمی بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یزید بھی انہی میں سے ایک تھا۔

اس کے بعد امام حسینؑ نے مزید وضاحت کی اور اس وقت یعنی سنہ ۶۱ھ کے حالات پر روشنی ڈالی۔ آپؑ نے کہا کہ یہ لوگ یعنی کارگرِ ایرانِ خلافت بنی امیہ شیطان کی پیروی اور اطاعت کرتے ہیں اور حتمی شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اسی نسبت

سے خدا کی اطاعت سے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ کھلم کھلا وہا ندلی مچانی ہوتی ہے۔ حدود اللہ کو معطل کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کے مال پر تصرف بیجا کر کے اپنا قبضہ جمایا ہے۔ بیت المال جو مسلمانوں کی عام فلاح و بہبود کے لیے تھا اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لیا ہے۔ جن کاموں کو اللہ نے حرام قرار دیا تھا انہیں حلال سمجھنے لگے اور جنہیں حلال قرار دیا تھا انہیں حرام ٹھہرا دیا۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو حسبِ فرمانِ رسولؐ اس حالت کو بدلنے کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ کس کی ہو سکتی ہے کیونکہ میں فرزندِ فاطمہؑ ہوں۔ اہلِ آیہ تطہیر ہوں، اہلِ آیہ مبالغہ ہوں، شاگرد و فرزندِ امیر المؤمنینؑ ہوں۔ یہ میرا کام ہے کہ میں امتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب کو دور کروں۔

واقعی حسینؑ بن علیؑ کا سا کارنامہ اور کون انجام دے سکتا تھا؟ ان کے جیسے اصحاب اور کسے میسر آسکتے تھے؟ اس تحریک میں ان کی جگہ اور کون لے سکتا تھا؟

ابن عباسؓ بڑے عالم اور قرآن مجید کے بڑے مفسر تھے۔ رسولِ خدا کے ممتاز صحابی اور چچا زاد بھائی تھے مگر کیا وہ، وہ کام انجام دے سکتے تھے جو حسینؑ بن علیؑ نے انجام دیا۔

محمد بن حنفیہؑ برادرِ حسینؑ اور فرزندِ علی بن ابی طالبؑ تھے لیکن وہ اس تحریک کے مرد میدان نہیں تھے۔

حبیب ابن مظاہرؑ سدی صحابی تھے لیکن امام حسینؑ کا سا کارنامہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی حال مسلم بن عوسجہؑ کا تھا اور یہی ہانی بن عروہؑ مرادی کا۔ امام کے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیلؑ آپ کے برادرِ عالی قدر حضرت ابوالفضل العباسؑ آپ کے فرزند اور محمد حضرت علی اکبرؑ یہ سب وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنہوں نے

اس عظیم اسلامی تحریک میں حیرت انگیز جرات اور جان نثاری کا مظاہرہ کیا۔ امام سے پورا تعاون کیا لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی اپنی بلند و بالا شخصیت کے باوجود اس تحریک کا مرکزی نقطہ بن سکتا تھا؟ اس روحانی تحریک کی مرکزی طاقت اور اخلاقی قوت دراصل امام حسینؑ کی شخصیت میں ہی پنہاں تھی۔ آپ ہی کی روحانی طاقت نے آخری مرحلے تک اس تحریک کی رہنمائی کی اور اپنے پسماندگان کو بھی ایسری کے آخری مرحلے تک رہبری و رہنمائی کے لیے آمادہ کیا۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

”تمہاری تحریریں اور تمہارے قاصد میرے پاس آئے اور انھوں نے تمہاری بیعت اور تمہاری بختگی کا حال بیان کیا۔ تم نے لکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اب اگر تم اپنی بیعت اور اپنے فیصلے پر قائم ہو اور جیسا کہ تم نے لکھا تھا میرا ساتھ نہیں چھوڑتے تو تم خوش بختی و کامرانی سے بہرہ ور ہو گے کیونکہ میں فرزندِ علیؑ و فاطمہؑ ہوں۔ میں خود اس جہاد مقدس میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میرے بیوی بچے تمہارے بیوی بچوں کے ساتھ ہر حال میں شریک ہوں گے۔ تمہیں یہ تزیب نہیں دیتا کہ تم اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جانیں میری اور میرے بیوی بچوں کی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھو۔ جب میں اپنی جان اور اپنے خاندان کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، تو تم بھی اپنی جان اور اپنے خاندان سے دریغ نہ کرو۔“

یعنی جب مجھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر اپنی جان جانے اور اپنے زن و فرزند کے اسیر ہو جانے کی پروا نہیں اور میں اپنے عزیزوں کو اپنے ساتھ لایا ہوں تو تمہارے لیے اب کیا گنجائش ہے؟

تھارا بھی فرض ہے کہ تم اپنے امام کی پیروی کرو۔ راہِ حق میں جاں نشاری سے دریغ نہ کرو۔ جاں کی قربانی اور قید و بند کی مصیبت سے نہ گھبراؤ اور امانِ اوقات اور فرزندِ پیغمبر کی ہمراہی سے پیچھے نہ ہٹو۔

لیکن اگر ان سب باتوں کے باوجود تم نے ایمان شکنی کی اور ایسے عہد میں کوتاہی کی تو جان عزیز کی قسم مجھے ذرہ بھر حیرت نہیں ہوگی کیونکہ تم نے میرے والد علی مرتضیٰؑ، میرے بھائی حسن مجتبیٰؑ اور چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کیساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ ایسا کرنے سے خود تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ تم خوش سختی اور سعادت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے گنوا دو گے۔ ایمان شکنی ہمیشہ خود نقصان اٹھاتا ہے اور ممکن ہے خدا جلد ہی مجھے تم سے بے نیاز کر دے۔

یہ خطبہ امامؑ نے حُر کے ایک ہزار ساتھیوں کے سامنے دیا۔ کان تو سب کے لگے ہوئے تھے لیکن دل پر ایک ہی کے اثر ہوا جس نے چند روز بعد دکھادیا کہ امامؑ کی بات اچھی طرح اس کے دلنشین ہو گئی تھی۔ ۷

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وہ ایک خود حُر بن یزید ریاحی رضی اللہ عنہ تھے جو صبح عاشور عمر بن سعد کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ کیا واقعی تم حسین بن علیؑ سے جنگ کرو گے؟ اس نے کہا: خدا ضرور کروں گا اور وہ بھی بہت سخت قسم کی۔ حُر نے کہا کہ اگر امامؑ کی کوئی تجویز بیان تو کیا حرج ہے؟ ابن سعد بولا کہ اگر مجھے اختیار ہوتا تو کوئی حرج ہمیں تھا، میں ضرور مان لینا مگر کیا کروں ابن زیاد، حسین بن علیؑ کی کوئی تجویز نہ ہے پر آمادہ

نہیں۔ اس پر اس مرد خوش انجام کی عقل اور اسکے نفس میں کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک طرف روحانی قوت تھی دوسری طرف شیطانی دوسو سے۔ آخر اس ملکوتی شعلے نے جو امام کی گفتگو نے اس کے دل میں روشن کر دیا تھا باطل کے خس و خاشاک کو جلا کر خاکستر کر دیا اور اس کی سعید روح نے فیصلہ کر لیا کہ راہِ خدا ہی اختیار کرنی چاہیے۔

اس نے کہا، خدا میں ایسے دورا ہے پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے ایک راستہ جنت کو جاتا ہے، دوسرا جہنم کو۔ اگر میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے جلا بھی دیجائے تب بھی میں جنت پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دوں گا۔ یہ کہہ کر امام کی خیمہ گاہ کا راستہ لیا۔ وہاں پہنچ کر اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا اور راہِ راست اختیار کرنی چرٹنے کہا، خدا جانتا ہے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اب میں توبہ کے خیال سے آیا ہوں، معلوم نہیں میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ امام نے کہا: ہاں خدا تیری توبہ قبول کرے گا اور تیری خطا میں معاف کر دیگا۔

درگہ مادرگہ نو میدی نیست

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

امام نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ کہا: محمد بن یزید۔ امام نے کہا: اَنْتَ حُرٌّ كَمَا سَمَّيْتَكَ اُمَّلَكَ "تم واقعی اسمِ بامستی ہو۔ تم بندہ آزاد ہو کیونکہ تمہاری ماں نے تمہارا نام حُرُّ رکھا تھا جس کے معنی ہیں آزاد۔ تم دنیا و آخرت میں آزاد ہو۔ اب سواری سے اتر آؤ۔ چرٹنے کہا: کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ میں کچھ دیر ان سواروں سے لڑوں اور شہادت سے سرفراز ہو کر ہی اتروں۔ امام نے کہا: خدا تمہاری مدد کرے جیسے دل چاہے کرو۔ چرٹو پس اہل کوفہ کے پاس گئے اور ان لوگوں سے جو ابھی کچھ دیر پہلے ان کے ہمدرد و ہمدار تھے یوں گفتگو شروع کی۔

اسے اہل کوفہ! تمہیں موت آجائے اور تمہاری مائیں تمہیں روئیں۔ پہلے تو تم نے خود اس بندہ خدا کو دعوت دیکر بلایا اور جب اس نے تمہاری دعوت قبول کر لی اور تمہارے پاس آگیا تو تم اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کل تم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی خاطر جان دیدو گے لیکن آج تم نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے اور اس کے سامنے نواہیں سونٹ کر کھڑے ہو گئے ہو۔ تم نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے اور سائنس تک لینے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ تم ہر طرف سے اس پر دیاؤ ڈال رہے ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ خدا کی وسیع زمین میں کہیں اسے اور اسکے اہل خاندان کو پتہ مل سکے۔ تم نے اسے قیدی بنا کر لے بس کر دیا ہے۔ دریائے فرات کا پانی جو مسلم اور غیر مسلم سب پیتے ہیں اور جس میں صحرائی جانور تہاتے ہیں، تم نے اس پر اس کے بیوی بچوں پر اور اس کے دوستوں پر بند کر رکھا ہے درآنحالیکہ پیاس کے مارے ان کا برا حال ہے۔ تم نے رسول خدا کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا ہے۔ اگر تم اب بھی توبہ کر کے ان کے قتل کے ارادے سے باز نہ آتے تو روزِ محشر خدا بھی تمہاری پیاس نہیں بجھائے گا۔

یہ تھی گفتگو اس مرد سعادت مند و خوش انجام کی جس نے ایک دن امام کا راستہ روکا تھا، ان کے زن و فرزند کو ہر سماں کیا تھا اور ان زیادہ کے حکم پر انہیں بیابان میں اترنے پر مجبور کیا تھا۔ دوسری تاریخ سے دس محرم کی صبح تک امام کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم میں اس کی حالت بدل گئی۔ روحانی انقلاب آگیا اور ایک بیک دل شہادت کے لیے ترپٹنے لگا۔ راہِ حق میں جان نثاری



کا ایسا منوالا ہوا کہ سب اندیشہ سود و زیاں جھلا کر سعادتِ ابدی کے حصول کے درپے  
 ہو گیا۔ سچ ہے، بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ بھیک! فرمانِ خداوندی ہے:  
 اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ  
 إِلَى النُّورِ (سورۃ بقرہ آیت ۲۵۷)  
 اللہ مومنوں کا حامی ہے، انھیں تاریکی سے نکال کر نورِ ہدایت  
 دکھاتا ہے۔“

وہی دستِ غیبی جو نا اہلوں کو حریمِ نیک نامی سے دھکے دیکر نکال دیتا ہے۔  
 سعید رحول کو میدانِ شہادت میں کھینچ لاتا ہے اور دشمن کی فوج کے ایک لاکھ  
 بن یزید کو حبیب بن مظاہر اسدی، بربر بن خضیر ہمدانی بلکہ علی بن الحسینؑ اور  
 فاسم بن الحسنؑ کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔

## امام حسینؑ کا کر بلا میں ورود

ماہِ محرم ۱۱ھ کی دوسری تاریخ کو چھبشتنبہ کے دن امام حسینؑ تاریخِ نبوی  
 میں کر بلا کے مقام پر پہنچے۔ اگلے دن عمر بن سعد بن ابی وقاص زہری چار ہزار  
 کی نفری کے ساتھ کوفہ سے آ پہنچا اور امامؑ کے بالمقابل پڑاؤ ڈال دیا۔ عمر بن سعد  
 کا تعلق قبیلہ قریش کی بنی زہرہ شاخ سے تھا اور جناب رسولِ خدا کی والدہ  
 حضرت آمنہؑ کا قریبی عزیز تھا اور اس کے والد سعد بن ابی وقاص ان پانچ آدمیوں  
 میں سے ایک تھے جو رسولِ خدا کی بعثت کے آغاز میں ابوبکر سے واقفیت کی بنا پر  
 مسلمان ہوئے تھے۔ سعد بن ابی وقاص کا نام فتوحاتِ اسلامی کے سلسلے میں  
 تاریخِ اسلام میں مشہور و ممتاز ہے۔ عمر بن سعد نے کسی کو امامؑ کے پاس بھیج کر

معلوم کرایا کہ آپ عراق کیوں آئے ہیں؟ آپ نے جو اب میں فرمایا، عراقیوں نے خود خط لکھ کر مجھے بلایا ہے۔ اب اگر تمہیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں حجاز واپس چلا جاتا ہوں۔ ابن سعد نے اسی مضمون کا خط ابن زیاد کو لکھ دیا اور جو کچھ امام نے فرمایا تھا اس کی اطلاع دیدی۔ ابن زیاد نے کہا کہ اب جبکہ وہ ہمارے بچے میں آگیا ہے، پھر بھی بچ نکلنے اور حجاز واپس چلے جانے کی اس لگائے ہوئے ہے، اب چھوڑ دینے کی کوئی صورت نہیں۔ پھر ابن سعد کو لکھا: میں نے تمہارا خط پڑھا۔ مضمون سے آگاہی ہوئی۔ حسین بن علیؑ سے کہو کہ وہ خود اور ان کے سب ہمراہی یزید کی بیعت کر لیں۔ جب بیعت مکمل ہو جائے گی تب ہم ان کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے۔ اس کے فوراً ہی بعد ابن زیاد کا ایک اور خط پہنچا کہ حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں کا پانی بند کر دو تاکہ انہیں پینے کے لیے ایک قطرہ پانی نہ مل سکے۔ عمر نے فوراً عمرو بن حجاج کو چار ہزار سوار دیکر بھیجا کہ ابو عبد اللہ اور فرات کے درمیان حائل ہو جائیں اور امام کا پانی کاٹ دیں۔ یہ واقعہ امام کی شہادت سے تین روز پہلے پیش آیا۔ امام نے ابن سعد کو ملاقات کرنے کے لیے بلایا۔ رات کو دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی۔ عمر بن سعد نے اپنے پیچھے میں واپس جا کر ابن زیاد کو خط لکھا کہ خدا نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا۔ ہمارے مابین اتفاق رائے ہو گیا ہے اور معاملہ قومی مصلحت کے مطابق طے پا گیا ہے۔ اب حسین بن علیؑ اس بات پر آمادہ ہیں کہ حجاز واپس چلے جائیں یا کسی اسلامی سرحد کے لیے روانہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ابن زیاد کو رام کرنے کے لیے ایک آدھ جملہ بطور دروغ مصلحت آمیز بھی بڑھا دیا۔ یہ خط ملنے پر ابن زیاد کچھ نرم پڑا اور ابن سعد کی تجویز مان لینے پر آمادہ ہو گیا مگر وہاں شہر میں ذی الجوشن بھی موجود تھا۔ اس نے کہا تم غلطی کر رہے ہو۔

اس موقع کو غنیمت سمجھو اور اب جبکہ حسینؑ بن علیؑ تمہارے قابو میں آگئے ہیں انہیں مت چھوڑو ورنہ پھر ایسا موقع نہیں ملے گا۔ ابن زیاد نے کہا کہتے تو سچ ہو۔ اب تم خود کر بلا جاؤ اور میرا یہ خط ابن سعد کو پہنچاؤ کہ حسینؑ اور ان کے ہمراہی بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دیں اور پھر انہیں کو فہ بھیج دیا جائے، اگر وہ انکار کریں تو ان سے جنگ کی جائے۔ اگر ابن سعد نہ مانے اور حسینؑ بن علیؑ سے لڑائی کے لیے تیار نہ ہو تو تم خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لو اور ابن سعد کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔ اس کے بعد ابن سعد کو لکھا کہ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ کوئی رد رعایت کرو یا مجھ سے ان کی سفارش کرو اور ان کی زندگی و سلامتی کی راہ ہموار کرو۔ اب دیکھو اگر وہ خود اور ان کے ساتھی مان جائیں تو انہیں میرے پاس بھیج دو اور اگر انکار کریں تو ان پر حملہ کر دو اور انہیں قتل کر کے ان کے ناک کان کاٹ لو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔ اگر حسینؑ بن علیؑ قتل ہو جائیں تو ان کی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کر دو کیونکہ وہ ایک ہم جو، حق ناشناس اور ظالم شخص ہیں۔ میرا دعایہ نہیں کہ مرنے کے بعد انہیں کوئی صدمہ پہنچے مگر میں نے ایک بات کہی ہے اور عہد کیا ہوا ہے کہ اگر وہ قتل ہوں گے تو ان کی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرونگا میں نے جو حکم دیا ہے، اب اگر تم اس پر عمل کرو گے تو تمہیں اس کا صلہ دوں گا۔ اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو لشکر سے الگ ہو جاؤ اور اسے شہر بن ذی الجوشن کے سپرد کرو۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیدی ہیں۔

جب ابن زیاد نے یہ خطرناک فرمان لکھ کر شہر کو دیا تو ام البنین کے بھتیجے عبداللہ بن ابی الملح بن حزام بھی اس موقع پر موجود تھے! انہوں نے اٹھ کر کہا کہ

اسے امیر امیری پھوپھی کے بیٹے عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان پسران علی بن ابی طالب بھی اپنے بھائی کے ساتھ آئے ہوتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ان کے لیے امان نامہ لکھ دیجیے۔ ابن زیاد نے کہا: بہت اچھا!

واقعی کیا ٹھکانہ ہے سوچ کے فرق کا کہ ایوا افضل کے ماموں کا بیٹا ابن زیاد سے امان نامہ حاصل کر کے بزم خود اپنی پھوپھی کے بیٹوں کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن کیا وہ اس امان نامے سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بھائی، اپنے آقا اور اپنے امام کو چھوڑ کر اپنی جان بچا کر چلے جائیں گے؟

## ام البنین کے بیٹوں

### کے لیے امان نامہ

جب عبداللہ کا غلام یہ امان نامہ لیکر کر بلا میں آیا اور ام البنین کے بیٹوں سے ملکر انھیں بتایا کہ تمہارے ماموں زاد بھائی عبداللہ نے تمہارے لیے یہ امان نامہ بھیجا ہے تو شاید اس کا خیال تھا کہ یہ سنتے ہی ان کی باچھیں کھل جائیں گی مگر وہ آخر امیر المؤمنینؑ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے ماموں زاد بھائی سے ہمارا اسلام کہنا اور بتانا کہ ہمیں ابن زیاد کے امان نامہ کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی امان ابن سمیہ کی امان سے بہتر ہے۔

جب شمر کر بلا پہنچا تو ابن زیاد کا خط عمر بن سعد کو دیا۔ دونوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔ آخر ابن سعد امیر کے حکم کی تعمیل کے لیے رضا مند ہو گیا۔ شمر کی بھی چونکہ ام البنین سے قرابت داری تھی اس نے بھی ان جوانوں کے لیے امان کا اعلان کیا مگر وہی جواب سنا۔

اس وقت عمر بن سعد اپنے مرکب پر سوار ہو کر اپنے لشکر کے سامنے کھڑا ہو کر پکارا "يَا خَيْلَ اللَّهِ اَرْكَبِي وَبِالْحَيَّةِ الْبَشْرِيَّ" عجیب بات ہے۔ یہ فقرہ رسول اللہ نے ایک غزوہ کے موقع پر اپنے اصحاب کو اسلام کے دفاع کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا۔ یہی فقرہ ابن سعد نے ۹ محرم کی شام کو فرزند رسول خدا اور ان کے جانشین برحق اور ان کے فرزندوں اور عزیزوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے سوارو! سوار ہو جاؤ۔ دیکھو تمہیں جنت میں جگہ ملے گی۔ اس وقت امامؑ اپنے خیمے کے سامنے ہاتھ میں شمشیر لیے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ذرا آنکھ لگی تھی کہ نزدیک ہی سپاہیوں کا غل سانی دیا۔ زینبؑ کبریٰؑ سرسیمہ دوڑی ہوئی بھائی کے پاس آئیں اور کہا: بھائی! یہ سپاہیوں کا غل سن رہے ہو۔ یہ نزدیک آ رہا ہے۔ امامؑ نے زانو سے سر اٹھایا اور کہا ابھی میں نے خواب میں رسول اللہؐ کو دیکھا ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم ہمارے پاس آرہے ہو۔ بھائی کے یہ الفاظ سن کر زینبؑ نے منہ پیٹ لیا اور کہا ہائے انسوس! امامؑ نے فرمایا: بہن انسوس کی کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت۔ تم پر خدا کی رحمت پڑے گی۔ انہیں میں عباسؑ علیہ السلام بھی آپہنچے اور انھوں نے اطلاع دی کہ دشمن سرسیمہ آپہنچا ہے، اب کیا کرنا چاہیے؟ امامؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: عباسؑ! تم خود سوار ہو کر جاؤ اور پوچھو کہ اس وقت حملہ کیوں کر رہے ہو؟ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟ عباسؑ بیس سواروں کو لیکر جن میں زبیر بن عقیل اور حبیب بن مظاہر اسدی بھی شامل تھے۔ دشمن کے لشکر کے سامنے گئے اور پوچھا کہ اس اچانک حملے کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے امیر کا حکم آیا ہے۔ تم ابھی پتھیا رڈال دو، ورنہ ہم جنگ کرینگے۔ عباسؑ نے کہا جلدی نہ کرو۔ میں ابھی ابو عبد اللہ کی خدمت

میں پہنچ کر اطلاع دیتا ہوں۔ عباسؑ کے ہمراہی وہیں دشمن کے لشکر کے سامنے کھڑے رہے اور پندرہ نصیحت کرتے رہے۔ عباسؑ امامؑ کے پاس آئے اور واقعہ گوش گزار کیا۔ امامؑ نے فرمایا: واپس جاؤ اور اگر ہو سکے تو کل صبح تک کی مہلت لے لو تا کہ آج کی شب ہم نماز و دعائیں گزاریں اور بارگاہِ خداوندی سے معافی طلب کریں۔ خدا جانتا ہے کہ مجھے نماز، قرآن اور دعا واستغفار دل سے پسند ہیں۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو اگلے دن صبح تک مہلت مل گئی۔ امامؑ نے اس تھوڑے سے موقع سے فائدہ اٹھا کر شہادت کی تیاری کی اور ایک بار پھر اپنے اصحاب کا امتحان لیا تاکہ اگر کوئی ابھی تک اس تحریک کے انجام سے بے خبر رہا ہے تو اب سمجھ لے کہ امامؑ کے سامنے بجز شہادت اور قربانی کے کوئی دوسرا راستہ نہیں اور جو شہادت کے لیے آمادہ نہ ہو چلا جائے اور میدان ان لوگوں کے لیے خالی کر دے جنھیں جان کی پروا نہیں۔

امام زین العابدینؑ اس سفر میں اپنے والد کے ہمراہ تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے دن چھپنے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کی۔ میں اگرچہ بیمار تھا پھر بھی وہاں چلا گیا تاکہ ان کی تقریر سن سکوں۔

قارئین! یہ تقریر وہ شخص کرتا ہے جو سو سے بھی کم ساتھیوں کے ساتھ بیس ہزار سے زیادہ دشمنوں کے زرخے میں تھا اور اسے صرف اگلے دن صبح تک کی مہلت تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ دشمن کا مطالبہ ماننے، بیعت کرنے اور فرمایا لوگوں کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دشمن اسے چھوڑے گا نہیں اور فیصلہ جنگ کے بغیر نہیں ہوگا۔ اس طرح اس کی اور اس کے ساتھیوں کی شہادت یقینی ہے لیکن اس کے باوجود کامل اطمینان اور دل جمعی سے بات کر رہا تھا

وہ اپنے ساتھیوں کو یاد دلایا تھا کہ کل روز شہادت ہے اور اصرار کر رہا تھا کہ تم میں سے ہر ایک میرے اہل خاندان میں سے کسی شخص کا ہاتھ پکڑے اور اس جھیلے سے نکل جائے۔ یہ لوگ صرف میرے درپے ہیں۔ اگر مجھ پر قابو پالیں تو پھر انھیں کسی سے کوئی سروکار نہیں۔

### شبِ عاشورا میں امام کا خطبہ

امامؑ نے اپنا خطبہ یوں شروع کیا:

”میں بہترین طریقے سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں عاقبت اور مصیبت دونوں میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ خدا یا میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے ہمیں پیغمبری کی نعمت سے نوازا، ہمیں قرآن سکھایا، ہمیں دین اور اس کے احکام کی سمجھ عطا کی۔ ہمیں آنکھیں، کان اور دل دیے، ہمیں شرک کی آلودگی سے پاک رکھا، ہمیں نعمتوں پر شکر کی توفیق بخشی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے اصحاب سے زیادہ با وفا اور بہتر اصحاب سے اور اپنے عزیزوں سے زیادہ صالح اور مہربان عزیزوں سے واقف نہیں ہوں۔ خدا تم سب کو جزائے خیر دے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس شکر سے ہماری جنگ کا وقت آ گیا ہے۔ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سب آزاد ہو۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاؤ۔“

شیخ مفید طبری، ابوالفرج اور ابن اثیر نے یہ خطبہ نقل کیا ہے مگر یہ کسی نے نہیں لکھا کہ اس موقع پر آپ کے اصحاب میں سے کوئی چلا گیا ہو۔ جانے والے

راستے ہی سے اس وقت اگک ہو گئے تھے جب مسلم بن عقیل، ہانی ابن عروہ، قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یفطر کی شہادت کی خبر ملی تھی۔ دستِ غیب نے نامردوں کو ابو عبد اللہ کے حریمِ قدس سے پہلے ہی نکال باہر کیا تھا۔

خطیبِ شبِ عاشوراء کے بعد اصحابِ امامؑ کی طرف سے سولے اظہارِ جانِ شاری اور استقلال و استقامت کے بڑے مؤرخوں نے اور کچھ نہیں لکھا۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ خطیبہ شہم کرنے کے بعد جب امامؑ نے اصرار کیا کہ تم مجھے چھوڑ دو اور اپنی جان سلامت لیکر اس مہیبت سے نکل جاؤ تو سب سے پہلے آپ کے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجیوں اور عبداللہ بن جعفر کے بیٹوں نے بیک آواز کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں! خدا وہ دن نہ لائے کہ آپ تو قتل ہو جائیں اور ہم زندہ رہیں۔ ابو الفضل العباس ان سب میں پیش پیش تھے۔

اس کے بعد امامؑ نے فرزند ان عقیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے فرزند ان عقیل یہی کافی ہے کہ مسلم مارے گئے۔ اب تم آزاد ہو، جہاں تمہارا جی چاہے چلے جاؤ۔ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! اگر ہم اپنے بزرگ، آقا اور اپنے بہترین عم زادگان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم ان کیساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے تو ہمیں کیا خبر ہوگی کہ ان پر کیا گزری۔ بخدا! ہم ایسا کام نہیں کریں گے بلکہ اپنے خاندان کے جان و مال کو راہِ خدا اور آپ کی اعانت میں قربان کر دیں گے۔ ہم آپ کے شانہ بشانہ لڑیں گے تاکہ شہادت کا فخر حاصل کر سکیں۔

تف ہے اس زندگی پر جو آپ کے بغیر ہو۔

اب مسلم بن عوسجہ اُٹھے اور کہا کہ اگر ہم آپ کی مدد سے یا تھکھنچ لیں اور آپ کو تنہا چھوڑ دیں تو خدا کو کیا جواب دیں گے۔ بخدا میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں



جاؤں گا۔ میں اپنا بیڑہ آپ کے دشمنوں کے کلیجے میں کھونپ دوں گا اور جب تک ہو سکے گا ان کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا اور جب میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں رہے گا تو ان پر پتھر برسائوں گا۔ خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لے کہ ہم نے اس کے پیغمبر کی غیر موجودگی میں ان کے فرزند کے حقوق کا لحاظ رکھا ہے۔ بخدا اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر آگ میں جلا کر میری راکھ ہوا میں بکھیر دی جائے گی۔ ستر دفعہ مجھے اسی طرح مارا اور جلا دیا جائے گا، تب بھی میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا اور آپ پر اپنی جان قربان کرتا رہوں گا۔ اب تو مجھے معلوم ہے کہ صرف ایک دفعہ قتل ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے سر بلند و سر فراز ہو جاؤں گا۔ مسلم بن یوسف نے اپنی بات ختم کی تو زہیر بن قین بکلی اٹھے۔ یہ وہی تھے جو کبھی ابو عبد اللہ کے دشمن تھے۔ عراق کے راستے میں ان سے دُور دُور رہتے تھے اور ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر تقدیر الہی کو کون بدل سکتا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا کہ زہیر راہِ خدا میں شہید ہو کر ہمیشہ کے لیے سرفراز اور نیک نام ہو جائیں اور ان کا نام تاریخِ عاشورا کی زینت بنے۔

زہیر نے اٹھ کر کہا کہ بخدا میں یہ چاہتا ہوں کہ مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر مارا جاؤں۔ ستر بار ایسا ہی ہوا تاکہ آپ اور آپ کے اہلبیت زندہ اور محفوظ رہیں۔ دوسروں نے بھی کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ امام نے ان کے لیے دعائے خیر کی اور اپنے نیچے میں لوٹ گئے۔

## جب امام نے اشعار کہے

امام سجادؑ فرماتے ہیں کہ شبِ عاشورا جب میں بیمار تھا، میری چھو بھی زینتؑ

میری تیمارداری کر رہی تھیں۔ میرے والد محترم اپنے مخصوص نیچے میں خلوت میں تھے صرف ابوذر غفاری کا سابق غلام جون بن جون ان کے پاس تھا اور ان کی تلوار دست کر رہا تھا۔ میرے والد کچھ اشعار گنگنارہے تھے۔ انھوں نے دو تین بار انہی اشعار کو دہرایا۔ میں نے غور سے سنا تو سچ گیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان اشعار میں ابو عبید اللہ کا اشارہ دنیا کی بے وفائی اور بے مہر سی کی طرف تھا کہ کبھی مہربان دوست کی طرح مسکراتی ہے۔ آدمی اس کی ہمدردانہ صورت پر فریفتہ ہو کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ زمانہ ہمیشہ موافق ہی رہے گا مگر دنیا بیکار یک طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر بے مٹنی دکھانے لگتی ہے۔ زندگی جو کبھی شہد و شکر کی طرح شیروں تھی تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ دوست جن پر پورا بھروسہ ہوتا ہے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں بلکہ بہت سے دوست تو خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے عورت طاقت، صحت اور سلامتی سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ کون ہے جس نے زندگی میں بازی نہیں ہاری اور کسے باحوادث کے تھپیڑے سہنے نہیں پڑے؟

امام ان اشعار کے پردے میں کہہ رہے تھے کہ کل کیسے کیسے گریل جوان شہید ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی کسی دوسرے کو اپنی جگہ حوادثِ روزگار کے حوالے کر دے، نہ کوئی خود کسی دوسرے کی جگہ لے سکتا ہے۔ جو زندہ ہے اسے ایک نہ ایک دن یہ راہ طے کرنی ہی ہے۔ آج ہماری توکل دوسروں کی باری ہے۔ امام چہارم فرماتے ہیں کہ میں اپنے والد بزرگوار کا مقصد سمجھ گیا۔ آپ اپنی شہادت کی خبر دے رہے تھے۔ میرا گلارندہ گیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور خاموش رہا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مصیبت آنے والی ہے۔ جو اشعار میں نے سنے تھے وہ چھو چھی زینبؑ نے بھی سنے اور چونکہ عورتیں طبعاً رقیق القلب ہوتی ہیں وہ

ضبط نہ کر سکیں۔ بے اختیار اٹھیں اور اسی طرح بلا چادر و روپوش بھائی کے پاس چلی گئیں اور کہا ہائے میرے بھیا! کاش میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی۔ آج میں بن ماں باپ بن بھائی کی ہو رہی ہوں۔ تم ہی جانے والوں کے جانشین تھے اور تم سے ہی رہنے والوں کو آسرا تھا۔ امامؑ نے کہا: "يَا اُخْتَيْتُ لَا يَذْهَبَنَّ بِحِلْمِكَ الشَّيْطَانُ" بہن! صبر کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ضبط کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھڑا دے۔ ۷

ضبط کرتا ہوں تو ہر زخم لہو دیتا ہے

نالہ کرتا ہوں تو اندیشہ رسوائی ہے

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امامؑ کے یہ دو بول اپنی بہن کے لیے بڑا سبق تھے! امامؑ انھیں ان دشوار حالات کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے جو کوفہ و شام میں پیش آنے والے تھے۔ امامؑ کی شہادت کے بعد مدینہ واپسی تک اس ہم کی قیادت بی بی زینبؑ ہی کو کرنا تھی۔ آپ یہ امانتِ الہی ان کے سپرد کر رہے تھے۔ امامؑ نے کہا بہن کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ضبط کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھڑا دے یعنی اپنی اہمیت کو سمجھو اور اس عظیم ہم میں تمہاری ذات پر جو ذمے داری عاید ہوتی ہے اسے نہ بھولو۔ جو کام تمہیں کرنا ہے وہ اس سے آسان نہیں ہے جو میں کر رہا ہوں تم اس فرض کو صرف اس اخلاقی اور روحانی عظمت اور بلند شخصیت ہی کی مدد سے انجام دے سکتی ہو جو تمہیں علیؑ و فاطمہؑ کی تربیت کے فیض سے حاصل ہوئی ہے اور جو تم نے ماں باپ سے ورثے میں پائی ہے۔ اگر آج بھائی کی شہادت کا اشارہ پاکر اور چند اثرا فریض شمر سن کر اظہارِ بیانی کرنے کو گئی تو کل کا ماجرا دیکھ کر کیسے برواشت کر دگی؟ کوفہ کے بازار اور پایہ تختِ کشور اسلامی یعنی دمشق میں کمال وقار

اور حوصلے کے ساتھ تقریریں کیسے کرو گی؟ دشمنانِ اہلبیتؑ کی چالاکیوں کا پردہ کیسے چاک کرو گی؟ آلِ ابی سفیان کی حکومت و خلافت کے عین مرکز میں لوگوں کو حقائق کی طرف کیسے متوجہ کرو گی؟ اور ان کے غلط پروپیگنڈے کا اثر ایک دو تقریروں میں کیسے نائل کرو گی؟

جب امامؑ نے یہ مختصر مگر پر معنی درس اپنی بہن کو دیا تو آپؑ خود بھی متاثر ہوئے اور آپ کے آنسو رواں ہو گئے۔ فرمایا: بہن کیا کروں؟ جو صورتِ حال ہے تم دیکھ رہی ہو۔ بی بی زینبؑ نے بھی کچھ اثر انگیز کلمات کہے اور یہ ہوش ہو گئیں۔ امامؑ بہن کو ہوش میں لائے اور صبر و ضبط کی بار بار تلقین کی۔ آپؑ نے فرمایا: بہن تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، صبر و ضبط سے کام لو۔ صرف اہل زمین ہی کو مرنا نہیں زمین اور آسمان میں ہر چیز فنائی ہے۔ بقا صرف اس ذات کو ہے جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانوں کو پیدا کیا۔ وہی انھیں ایک دن پھر زندہ کرے گا۔ وہ خود یگانہ و نہاں ہے۔ بہن میرے نانا محمدؐ سے بہتر تھے۔ میرے بابا محمدؐ سے بہتر تھے۔ میری ماں اور میرے بھائی محمدؐ سے بہتر تھے۔ ہر مسلمان کو رسولِ خدا کے راستے پر چلنا ہے۔

اس قسم کی تسلیاں دینے کے بعد امامؑ نے فرمایا: خواہر عزیز! میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور تم اس قسم پر عمل کرنا۔ محمدؐ پر جو مصیبت آئے اس کی وجہ سے گریبان چاک نہ کرنا، اپنا چہرہ زخمی نہ کر لینا اور نالہ و فریاد نہ کرنا۔

شبِ عاشورا گزر گئی جو اب پھر انسانیت کی تاریخ میں کبھی نہیں آئے گی۔ کیسی کیسی شخصیتیں تھیں جو اس شبِ راہِ خدا میں شہادت کے لیے صبح کا انتظار کر رہی تھیں، جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے بے چین تھیں جو ان پر رسولِ خداؐ اور امیر المؤمنینؑ کی طرف سے عاید تھا۔ اب زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے ایسی شخصیتیں دوبارہ

ظہور میں نہیں آسکتیں اور نہ اب وہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ان شخصیتوں کی نشوونما ہوتی تھی۔ اب تو شبِ عاشورا اور شبِ یازدہم محرم دوبارہ صرف اسی صورت میں آسکتی ہیں کہ قرآن پھر نازل ہو، خاتم الانبیاء جیسا پیغمبر پھر مبعوث ہو، علیؑ اور فاطمہؑ جیسے والدین ہوں۔ اہلبیتِ عصمت کا سہما حوالہ ہو، وہ حالات ہوں جن میں بنی ہاشم کے وہ سترہ جوان وجود میں آئے جو ان کے امامؑ کے بقول رونے زمین میں بے نظیر تھے۔ حبیب بن مظاہر اسدی جیسے شیر دل اصحابِ ابوجہل اللہیوں اور پھر اسلام کو دہی خطرہ لاحق ہو جو اس وقت بنی امیہ کی بدولت تھا یعنی اللہ کے سب ہی اچھے بڑے حالات دوبارہ پیدا ہوں۔

### صبحِ عاشورا

شبِ عاشورا امامؑ اور ان کے ہمراہیوں نے نمازِ دعا، استغفار اور آرام میں گزار دی۔ صبح دم ان کا روزِ پُراختیار آ پہنچا۔ شیخ مفید کتاب ارشاد میں اور طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد امامؑ نے صفِ آرائی کی۔ کل ۳۲ سوار اور ۴ پیادہ آپ کے ہمراہ تھے۔ زہیر بن قیس کو میمنہ کی کمان دی اور حبیب بن مظاہر کو میسرہ پر مقرر فرمایا۔ علم اپنے بھائی عباس کے ہاتھ میں دیا۔ اس روز صبح کو عمر بن سعد نے بھی اپنے لشکر کی صفِ آرائی کی۔ میمنہ کی قیادت عمرو بن حجاج نے سیدی کو دی اور میسرہ کی شمر بن ذی الجوشن کو۔ سواروں کے دستے کا رئیس عزرہ بن قیس احمسی کو مقرر کیا اور پیادہ فوج کا شدت بن ربعی کو۔ پرچم اپنے غلام کو دیا۔ امامؑ نے روزِ عاشور کسی مرتبہ لوگوں سے خطاب کیا اور خطبہ پڑھا۔ دن کا آغاز دعا سے کیا اور ہر مرتبہ خطبے سے یاد دشمن سے گفتگو کرنے سے پہلے بارگاہِ رب العزت میں توفیق و ہدایت کی التجا کرتے رہے۔ آپ کے تمام

خطبوں اور دعاؤں میں فصاحت و بلاغت کا کمال جلوہ گر ہے۔ دشمن کے لشکروں سے گفتگو اس اطمینان، سکون اور وقار سے کی گویا وہ سب آپ کے عقیدہ تہذیبوں اور آپ کی مدد کے لیے جمع ہوئے ہوں حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان خطبوں کے بعد ہی لوگ آپ کو قتل کرنے والے ہیں اور یہی تیس ہزار نیزوں سے حملہ آور ہونگے۔ یہ خطبے وہ خطیب دے رہا تھا جو پیاسا تھا۔ جس کے پاس ہونٹ تر کرنے کو بھی ایک قطرہ پانی نہیں تھا، جسے معلوم تھا کہ محوڑی دیر بعد اس کے بیوی بچے بے رحم اور گستاخ دشمن کے ہاتھوں ایسے ہو جائیں گے۔ جو بھوکا تھا اگرچہ اپنی مردانگی اور صلے کی وجہ سے عاشورے کے دن بھوک کی شکایت زبان پر نہیں لایا، صرف پیاس ہی کی شکایت کی مگر ایام سجادؑ نے کہا ہے کہ پیغمبر کے نواسے کو اس حالت میں قتل کیا گیا کہ وہ تشنہ لب اور بھوک کے پیٹ تھا۔ واقعی ہجرت کا مقام ہے کہ ایک بھوکا اور پیاسا خطیب کئی ہزار دشمنوں کے سامنے تقریر کرتا ہے جو اسے قتل کرنے پر کمر بستہ ہیں، اگرچہ پریشانی اور اضطراب کے تمام اسباب جمع ہیں مگر وہ جو بات کہتا ہے نہی تلی کہتا ہے، فصیح و بلیغ کہتا ہے، پورے سکون و اطمینان سے کہتا ہے۔ بہت ہی کم بالوسی اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے جیسے جیسے اسکے ساتھی قتل ہوتے جاتے ہیں اور اسکی جمعیت کم ہوتی جاتی ہے اسکی تقریر کا ولولہ بڑھتا جاتا ہے اسکا حوصلہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سکون اور اطمینان کا اظہار کرتا ہے تاریخ انسا میں ایسے مقرر اور خطیب کہاں ملتے ہیں؟ بے بارود کا خطیب جسکی خطابت حالات سے متاثر نہیں ہوتی پریشانی اور گھبراہٹ کے تمام اسباب موجود ہیں لیکن اسکی ہمت بلند ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں۔ تشویش کا اس پر کوئی اثر نہیں ہے۔

صبح عاشورہ دشمن کے سواروں نے امامؑ کی صفوں پر حملہ کیا اور امامؑ نے

دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے :

”خداوند! ہر مصیبت کے وقت مجھے تجھ ہی پر بھروسہ ہے اور ہر سختی میں تجھ ہی سے امید ہے۔ ہر مشکل میں تو ہی میرا چارہ ساز اور سہارا ہے۔ میں نے کتنی ہی ایسی پریشانیوں میں جن سے دل ڈوبنے لگتا ہے، جن کا کوئی علاج نظر نہیں آتا، جن میں دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور دشمن مذاق اڑاتے ہیں، سب کو چھوڑ کر تجھ سے مدد مانگی تو تو نے مجھے تسکین اور راحت بخشی اور ان پریشانیوں کو دور کر دیا ہر نعمت اور ہر نیکی تیری ہی طرف سے ہے اور سب کچھ تجھ ہی سے مانگنا چاہیے“

اس کے بعد امامؑ اونٹ پر سوار ہوئے اور یہ آواز بلند — جسے اکثر لوگ سن سکتے تھے — فرمایا:

### شکرِ زید سے امامؑ کا خطاب

”اے اہل عراق! میری بات سنو اور میرے قتل میں جلدی نہ کرو تاکہ میں تمہیں سمجھا سکوں اور اپنے عراق آنے کی وجہ بتلا سکوں۔ اگر یہ وجہ تمہارے دل کو لگی اور تم نے یقین کیا تو میرے ساتھ انصاف کرو گے اور خود اپنے لیے خوش سختی کی راہ ہموار کرو گے پھر تمہارے پاس مجھے قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ اگر میری بات کو تسلیم نہیں کرو گے تو بے انصافی اور ظلم کرو گے۔ مجھے قتل کرنے سے پہلے اس بات کے پس و پیش پر اچھی طرح غور کرو۔ بے سمجھے بوجھے ایسے نازک کام میں ہاتھ نہ ڈالو۔ میرا حامی وہی اللہ ہے جس نے قرآن بھیجا ہے“

ابھی امامؑ یہیں تک پہنچے تھے کہ آپ کے کالوں میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے نالوشیوں کی صدا آئی۔ آپ نے اپنے بھائی عباسؑ اور اپنے بیٹے علیؑ کے ساتھ کہا: جاؤ ان خواتین سے کہو کہ خاموش رہیں، بعد میں رونے کا بہت موقع ملے گا۔ جب پردہ نشینانِ حرمِ عصمت و طہارت کی آواز آنا بند ہو گئی تو آپ نے خدا کی حمد و ثنا کی فرشتوں اور پیغمبروں پر درود بھیجا۔ اس کے بعد ایسے مبلغ انداز میں بات شروع کی کہ یہ شیوا بیانی نہ آپ سے پہلے کسی مقرر کو نصیب ہوئی نہ آپ کے بعد۔ آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

”لوگو! مجھے پہچانتے ہو؟ دیکھو میں کون ہوں، اچھی طرح سوچ لو کہ کیا مجھے قتل کرنا اور میری حرمت کو پامال کرنا تمہارے لیے جائز ہے؟ کیا میں تمہارے پیغمبر کا نواسا نہیں ہوں؟ کیا تمہارے پیغمبر کے وصی ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور انکی تصدیق کرنے والے میرے ہی والد نہیں تھے؟ کیا حمزہ بن عبدالمطلب سید الشہداء میرے والد کے چچا نہیں تھے؟ کیا جعفر بن ابی طالب ذوالجناحین جو فرشتوں کے ساتھ پرواز کرتے ہیں میرے چچا نہیں تھے؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اللہؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہم دونوں جو انانِ جنت کے سردار ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جو میں کہ رہا ہوں سچ ہے تو بہتر ہے۔ خدا کی قسم جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ جھوٹوں کا دشمن ہے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تاہم اگر تمہیں میرے یقین نہیں تو ابھی تمہارے درمیان ایسے اصحاب رسولؐ موجود ہیں کہ اگر تم ان سے پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔“



جابر بن عبد اللہ انصاری یا ابو سعید خدری یا سہیل بن سعد سعدی یا زید بن ارقم یا انس بن مالک سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ انھوں نے یہ بات میرے اور میرے بھائی کے بارے میں خود رسول اللہ سے سنی ہے۔ کیا یہی حدیث تمہیں میرے قتل سے باز رکھنے کے لیے کافی نہیں؟“

پھر فرمایا:

”اگر تمہیں اس حدیث میں شبہ ہے تو کیا اس میں بھی شبہ ہے کہ میں رسول اللہ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب میں اس وقت میرے سوا رسول کا کوئی اور نواسا نہیں۔ سچ کہو کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے کہ تم اس کا قصاص چاہتے ہو؟ کیا میں نے تمہارا مال لوٹا ہے کہ تم اس کا مطالبہ کر رہے ہو؟ کیا تم میں سے کسی کو زخمی کیا ہے کہ تم اس کی تلافی کے لیے اٹھے ہو؟“

امام نے اس قسم کی جنتی باتیں کہیں ان میں سے کسی کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ناچار آپ نے کچھ لوگوں کا نام لیکر ان سے خطاب کیا۔ فرمایا:

”اے شہبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے

یزید بن حارث، کیا تم نے مجھے خط نہیں لکھا تھا کہ میوے پک گئے

ہیں، زمینیں سرسبز و شاداب ہیں، عراق کے سپاہی آپ کے لیے

جان دینے پر آمادہ ہیں، لہذا جلد سے جلد عراق کے لیے روانہ ہو جائیے“

طبری لکھتا ہے کہ ان لوگوں نے امام کے جواب میں کہا کہ نہ ہم نے کوئی

خط لکھا اور نہ ہی ہمیں اسکی خبر ہے جو کچھ کہ آپ کہہ رہے ہیں، واقعی پستی اور

دنایت کی انتہا ہے کہ وہی لوگ جنہوں نے خط پر خط لکھ کر امامؑ کو بلایا تھا اور خطوں پر خود دستخط کیے تھے، آج کمال بے شرمی سے انہیں جواب دے رہے ہیں کہ نہ ہم نے خط لکھا اور نہ آپ کو بلایا۔

یہاں ہم ان ذلیل لوگوں میں سے ایک کا تعارف فارین سے کرانا چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آدمی دنیا پرستی اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں کہاں تک جاسکتا ہے۔ بعض لوگ واقعی ہر روز رنگ بدلتے ہیں۔ صبح کچھ اور شام کچھ۔ ایک دن خدا کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں تو اگلے دن خدا کی مخالفت میں۔ آج علیؑ کے دوست ہیں تو کل ان کے دشمن۔ ایک دن امام حسینؑ کو قتل کرتے ہیں تو دوسرے دن ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش شہت بن ربیع یعنی یہی شخص جو اس وقت عراقی فوج کا ایک افسر تھا اور قاتلانِ حسینؑ میں سے ایک ہے، کسی زمانے میں سجاج کا مؤذن تھا۔ جب اس عورت نے نبی تمیم کے قبیلے میں نبوت کا دعویٰ کیا تو اس نے اُس کی مؤذنی قبول کر لی۔ پھر جب سجاج ذلیل ہو گئی تو شہت اسلام لے آیا۔ قتل عثمان کے وقت اس کام میں شریک رہا۔ پھر اصحابِ علیؑ میں شامل ہو گیا۔ بعد میں علیؑ کے خلاف بغاوت کی اور خواج سے مل گیا۔ پھر خراجیت سے توبہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۶۱ھ میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے قتل میں شرکت کی اور اس کا ربدہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد میں جب مختار بن ابی عبیدہ ثقفی نے خونِ حسینؑ کا مطالبہ کیا تو شہت بن ربیع جو خود قاتلانِ امامؑ میں سے تھا خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کے لیے مختار کیساتھ ہو گیا۔ بعد میں کوفہ کی پولیس کاربنس بن گیا اور حضرت مختار کے قتل میں بھی شریک رہا۔ ستمہ کے قریب مر گیا۔ ایسے لوگوں کا اخلاق اور روحانیت میں کوئی حصہ

نہیں ہوتا۔ یہ کہاں ممکن ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کی ملکوتی روح سے یہ لوگ کوئی استفادہ کر سکیں یا امامؑ کے نفسِ مطمئنہ کی کوئی شعاع ایسے بڑا استعداد لوگوں پر پڑ سکے۔

گر نہ بیند بروزِ شپہرہ چشم  
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

امامؑ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ بخدا میں مجبوروں اور ذلیلوں کی طرح ان لوگوں کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گا اور میں جھوٹوں کے ساتھ میدانِ جنگ سے غلاموں کی طرح نہیں بھاگوں گا۔ میں تم لوگوں کے شر سے اور ہر متکبر سے جو روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا، اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

اتنے میں آہستہ آہستہ لڑائی کی تیاری شروع ہو گئی۔ عمر بن سعد نے ایک تبر چلے پر چڑھایا اور ابو عبد اللہؑ کے لشکر کی طرف چھوڑ دیا اور کہا۔ ابن زیاد کے سامنے گواہ رہنا کہ میں نے سب سے پہلے جنگ شروع کی ہے۔ ظہر تک لڑائی شدت کے ساتھ ہوتی رہی اور امامؑ کے بیشتر اصحاب شہید ہو گئے۔ ظہر کی نماز امامؑ نے بصورتِ نماز خوف اپنے بقیہ اصحاب کے ساتھ دو رکعت پڑھی۔ نماز کے بعد پھر اسی طرح لڑائی شروع ہو گئی، یہاں تک کہ جو اتان بنی ہاشم میں سے بھی کوئی نہ بچا اور وہ بھی یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تھے کہ خورد سال اور شیر خوار بچے بھی شہداء کے درجے پر فائز ہوئے۔ آہستہ آہستہ وہ وقت بھی آ گیا جس نے اسلامی تاریخ کا رخ بدل دیا اور تاریخِ شہادت میں امام عالی مقام کا نام سنہری حروف میں ثبت کر دیا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں روزِ حسینؑ (یوم عاشورا) جیسا کوئی اور دن نہیں۔

وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

تحقیق سے ان لوگوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں جو روزِ عاشورا امامؑ کی ہمراہی میں شہید ہوئے۔ مشہور یہ ہے کہ بہترین شہید ہوئے۔

طبری کے مطابق امام حسینؑ کے اصحاب میں سے بہتر اشخاص شہید ہوئے۔ شیخ مفید نے لکھا ہے کہ عمر بن سعد نے روزِ عاشورا ہی امامؑ کا سر عبید اللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیا اور حکم دیا کہ اصحابِ اہلبیتؑ میں سے سب شہداء کے سر کاٹ لیے جائیں۔ یہ کل بہتر مرتھے۔ اس زیارت میں بھی جو سید بن طاووس نے اقبال میں نقل کی ہے، بہتر شہداء ہی کا تذکرہ ہے۔ یہ زیارت جو ۲۷۲ھ میں ناحیہ مقدسہ ساہرا سے جاری ہوئی، غالباً امام حسن عسکریؑ کی طرف سے جاری ہوئی، نہ کہ امام زمان کی طرف سے کیونکہ ۲۷۲ھ تک امام زمان متولد نہیں ہوئے تھے اور آٹھ سال بعد تک یعنی ۲۸۰ھ تک امام یازدہم زندہ تھے۔ اس زیارت میں سترہ شہدائے بنی ہاشم اور اس کے بعد پچپن اصحاب کے نام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان بہترین کے کارنامے کو بڑی دقیق نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اتنی کم جمعیت نے اتنا عظیم کارنامہ کیسے انجام دیا! اگر امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا کوئی دنیوی مقصد ہوتا اور وہ عام لوگوں کی طرح کسی مادی غرض کے لیے مارے جاتے تو وہ دنیا میں یہ عظمت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے اس تحریک کی صورت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کسی مادی یا شخصی غرض سے آلودہ نہیں تھی۔ جو اہمیت اس تحریک نے تاریخِ اسلام بلکہ تاریخِ عالم میں حاصل کی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس وقت جو دنیا نے اسلام کی حالت تھی اس نے امام پر ایک فرض عائد کر دیا تھا۔ ان حالات میں آپ نے یہی طے کیا کہ اسلام کی حفاظت اسی پر منحصر ہے کہ آپ اٹھیں اور اپنی جان پر کھیل جائیں۔

## تخریکِ کربلا اور منفی اندازِ فکر

امام حسینؑ ایک بلند نصب العین لیکر اٹھے تھے۔ ان کا مقصد نہیں تھا کہ یزید کو اقتدار سے ہٹا کر خود حکومت پر قبضہ کر لیں۔ انھیں یزید سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو حق کے طرفدار تھے چاہے حق کی جو بھی شکل ہو اور باطل کے مخالف تھے چاہے اس کا سر براہ یزید ہو یا کوئی اور۔ یہ بہترین جو امامؑ کو ملا کہ تمہارے جانتے ہیں اس لیے اٹھے تھے کہ اس دنیا میں دین زندہ رہے۔ وہ اس لیے نہیں اٹھے تھے کہ ان کے گناہ دھل جائیں اور ان کا معاملہ ان لوگوں سے الگ ہو جائے جو ساری عمر گناہ کرتے رہتے ہیں۔ نہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو باطل حرام جمع کر کے دولت اکٹھی کرتے ہیں اور ایک دفعہ کربلا یا مکہ جا کر پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ اپنے مال حرام میں سے کچھ وقف بھی کر دیتے ہیں تاکہ خدا ان کے بقایا مال سے چشم پوشی کرے۔ یہ بہتر افراد مجموعی طور پر نہ گنہگار تھے نہ قرضدار۔ ان کے قائد امام حسینؑ تو معصوم تھے جو عمر بھر ہر چھوٹے بڑے گناہ سے مبرا رہے۔ جو انان بنی ہاشم کا بھی شعار تقویٰ تھا اور وہ علاقہ عصمت میں ایک مقام رکھتے تھے۔ امام کے اصحاب بھی اپنے زمانے میں عبادتِ تقویٰ اور دین داری کے لحاظ سے برگزیدہ اور نامور تھے۔ کیا انھوں نے جیسا کہ بہت سے لوگ تصور کرتے ہیں اس لیے شہادت پائی کہ گنہگار ان امت کے لیے ڈھال بن جائیں یعنی اگر اس سے پہلے مسلمان یا شیعہ ڈرتے ڈرتے گناہ کرتے تھے تو اب امامؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے بعد پوری بے باکی اور اطمینان سے گناہ کریں۔ جتنا چاہیں لوگوں کو دھوکا فریب دیں اور حساب کتاب سزا و جزا کا ذرہ برابر بخوف دل میں لائیں

کیونکہ امام حسینؑ نے گنہگارین امت کی خاطر جان دی ہے اور امامؑ اس لیے شہید ہوئے کہ امت کے گناہ بخشے جائیں۔ لوگ گناہ کرتے ہیں اور کرتے ہی رہیں گے۔ امامؑ نے کفارہ دیدیا۔ سب کام ٹھیک ہو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ گئے۔ گنہگار عیسانی بے فکر ہو گئے۔ امام حسینؑ نے بھی قتل ہو کر امت کے گنہگاروں کا بچہ کر دیا۔

نعوذ باللہ! سوچ کا یہ انداز جو شاید عوام کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو، امامؑ کے نصب العین کے بالکل برعکس ہے۔ امامؑ کی تحریک کا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ اور بھی خوفِ خدا کریں، گناہوں سے اور زیادہ بچیں، فرائض مذہبی کی بجا آوری کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ وہ تو اس لیے اٹھے تھے کہ گناہ کی بساط لپیٹ دیں، لوگوں کو برائیوں سے روکیں اور ان میں تقویٰ کی روح پھونکیں۔ وہ اس لیے اٹھے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، معاصی اور مفاسد کے سیلاب کو روکیں، لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کو مضبوط کریں، انہیں خدا کی طرف متوجہ کریں، قرآن اور اس کی تعلیمات کے مطابق تربیت کا ماحول پیدا کریں تاکہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں لوگ جھوٹ نہ بولیں، خیانت کے فرنگ نہ ہوں، جو کام کریں دیا ننداری کے ساتھ کریں، شجاع اور دلیر ہوں، خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، صرف حق کو تسلیم کریں اور جو بات کریں قاعدے کی کریں۔ امامؑ نے اس لیے جان نہیں دی کہ لوگوں سے کہیں کہ اب میری شہادت کے بعد تمہیں سچ بولنے، دیا نندار ہونے، عبادت کرنے، حلال کی روزی کمانے، حرام سے بچنے اور دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ امامؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں اس لیے قتل ہوا ہوں تاکہ میرے شیعہ بے فکری اور بغیر کسی وعدے

کے جی بھر کے گناہ کریں۔ یہ طرز فکر مسلمانوں کے لیے شرمناک اور شہدائے راہِ خدا کی مقدس ارواح کے لیے جو صرف گناہ اور بے دینی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے ہیں تکلیف دہ ہے۔ اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں کہ کوئی شخص خدا سے دور ہٹ کر امام سے نزدیک ہو جائے یا خدا کو ناراض کر کے امام کی نوازش و دی حاصل کرے یا اپنے گناہوں کا ایک حصہ امام کے پلے میں ڈال دے تاکہ خدا اس سے باز پرس نہ کرے۔

جو لوگ یہ طرز فکر رکھتے ہیں وہ نہ فقط اسلام و روح اسلام اور امام حسینؑ کی تحریک سے غداری کرتے ہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شہادتِ امام کے سزا سے اللہ کے قانونِ حرام و حلال اور عذاب و ثواب کے مقابلے پر اپنا الگ کاروبار جمایا ہے۔ بد قسمت ہے وہ مسلمان جو نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے یا حقوقِ انبیاء کا پاس نہ کرے یا حرام کاریوں میں مبتلا ہو یا سوردے اور حرام کی کمائی پر زندگی بسر کرے اور پھر خوش ہوتا رہے کہ میں امام حسینؑ کا عقیدہ مند ہوں۔ ایسے مسلمان سے پوچھنا چاہیے کہ تو امام حسینؑ کا عقیدہ مند کیوں ہے، جب نہ تجھے امام حسینؑ کے کام پسند ہیں اور نہ انھیں تیری حرکتیں۔ وہ راست گو تھے، تو جھوٹ بولتا ہے یہ دبا نترار تھے، تو بددیانت ہے۔ انھوں نے شبِ عاشورا میں اس لیے مہلت لی تھی کہ ایک رات نماز، دعا، استغفار اور تلاوتِ قرآن میں گزار سکیں۔ تیری اکثر راتیں معصیت اور تاپسندیدہ کاموں میں گزرتی ہیں۔ انھوں نے راہِ خدا میں سب کچھ قربان کر دیا اور تو خدا کی راہ میں پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کا روادار نہیں۔ بہت سے لوگ امام حسینؑ کے اس لیے عقیدہ مند ہیں کہ انھوں نے امام کو سمجھا نہیں۔ وہ اس خیال میں ہیں کہ ہو سکتا ہے محض معمولی سلام دعا سے امام کو اپنا طرفدار بنا لیں۔ ایسے ہی بہت سے لوگ بلا وجہ امامِ ہندی کے ظہور کے انتظار

ہیں بیٹھے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ امام کے ظہور سے ان کا کوئی بھلا نہیں ہو گا کیونکہ جس امام کی وہ اس لگائے ہوئے ہیں وہ کبھی ظاہر نہیں ہونگے اور جو امام ظاہر ہوں گے، وہ اپنے مریدوں میں روپیا اور نوکر یا تقسیم نہیں کریں گے۔

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جو شخص پیغمبری اور امامت کا صحیح مفہوم سمجھتا ہے وہ اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا نہیں ہوتا اور خدا کے مقابلے میں پیغمبر و امام کا کارخانہ نہیں کھولتا۔ وہ جانتا ہے کہ پیغمبر و امام کی بزرگی خدا کی بندگی کی بنیاد پر قائم ہے اور خدا کا بندہ بنے بغیر کسی پیغمبر یا امام سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

گر تو خواہی حری و دل زندگی

بندگی کن، بندگی کن

امام حسینؑ نے روزِ عاشورا اس قدر آفات اور باوجود اس کے کہ دشمن چند لمحے بھی نماز کے لیے جنگ بند کرنے پر تیار نہیں تھا، عین معرکہ کارزار میں ظہر کی نماز یا جماعت ادا کی۔ یہ امامؑ اس بات سے کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ کوئی بجائے نماز کے صرف عزاداری کرے یا ان کی شفاعت کی امید پر واجبات کو نظر انداز کر دے اور برے کاموں کا مرتکب ہو۔ عزاداری امامؑ سے تو دین شناسی میں اور بھی اضافہ ہونا چاہیے کیونکہ عزاداری خدا سے نزدیک کرتی ہے اور گناہ و معصیت سے دور رکھتی ہے۔ تعلق مع الدین کو مضبوط کرتی ہے اور روح توحید کو زندہ کرتی ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مجالسِ عزائے حسینؑ اسی وقت خدا کی خوشنودی کا سبب اور موجب اجر و ثواب ہیں جب اللہ کی



بندگی کی حدود میں انجام پائیں، ان میں جھوٹ نہ ہو، کوئی ناجائز کام نہ ہو۔ گناہ کے ذریعے خدا کی عبادت نہیں کی جاسکتی اور حرام کو عبادت کی تمہید نہیں بنایا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو تقویٰ کی حدود میں انجام دیا جائے۔ جو عمل تقویٰ کے ساتھ کیا جائے گا ضرور قبول ہوگا اور اس سے نفس کی اصلاح اور کسی نہ کسی حد تک روحانی ترقی ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نیک کام کیا جائے اور اس کا اثر باطن پر نہ پڑے۔ یہ نیک کام کا اچھا اثر ہی تو ہے جو تو اس اخروی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کسی کام سے ثواب ہونے کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک اس کا روح پر اچھا اثر نہ ہو۔ اسی طرح کسی کام کے موجب عذاب ہونے کے بھی اس وقت تک کوئی معنی نہیں جب تک روح پر اس کا بُرا اثر مرتب نہ ہو۔ وہ لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو بظاہر نیک کام کرتے ہیں لیکن ان کے باطن پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی کوئی روحانی ترقی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بے شمار ثواب کمالیا ہے۔ نیک کام سے انسان کی روحانی تربیت اور اصلاح باطن ہونی چاہیے۔ رذائل کا قلع قمع اور اخلاقی فضائل کی ترقی ہونی چاہیے۔ اگر نیک کام پر یہ اثر مرتب نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو وہ اچھا کام نہیں تھا یا صحیح طریقے سے انجام نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں اکثر توقع کے برخلاف نفس انسانی پر اٹا برا اثر بھی ڈر سکتا ہے۔ **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا** جو اپنے رب سے ملنے کا خواہشمند ہو اسے نیک اختیار کرنی چاہیے۔ (سورہ کہف - آیت ۱۱)

ماہِ محرم ۱۱۰ھ میں دریائے فرات کے کنارے سرزمین عراق میں جو واقعہ پیش آیا وہ اس زمانے میں تاریخی لحاظ سے بہت ہی معمولی اور غیر اہم نظر آتا تھا۔ اموی دربارِ خلافت کی طرف سے ایک لشکرِ جبار بھیجا گیا۔ اس نے اس جماعت کا محاصرہ کر لیا جس کی تعداد سو سے بھی کم تھی اور اس کے ارکان پر دباؤ ڈالا کہ خلیفہ وقت کی بیعت کریں اور اس کے حکم کے سامنے تسلیمِ خم کر دیں چونکہ اس جماعت نے بیعت کرنا قبول نہ کیا لہذا سخت جنگ چھڑ گئی جس کا فیصلہ ایک دن سے بھی کم مدت میں ہو گیا۔ اس چھوٹے سے لشکر کے سب افراد مارے گئے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حادثہ بھی دیگر سینکڑوں حادثوں کی طرح انسانی تاریخ کے کسی گمنام گوشے میں دفن ہو جائیگا اور وقت گزرنے کیساتھ فراموش کر دیا جائیگا۔ اس حادثے کی وجہ سے اس وقت کے مسلمانوں کی زندگی کے عام معمولات متاثر نہیں ہوئے۔ ہر شخص اپنے اپنے کاروبار میں اسی طرح منہمک رہا جیسے پہلے تھا۔ پیشہ وراپنے اپنے پیشے میں لگے رہے مسجدیں ویسے ہی آباد رہیں۔ نماز باجماعت ہوتی رہی۔ خطیب حسب دستور منبر پر حلال و حرام، ہمشیت و دوزخ اور ثواب و عذاب کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے مذہبی مضامین بھی موضوع گفتگو بنتے رہے لیکن اس سلسلے کا جو بظاہر بہت معمولی اور مختصر واقعہ تھا کہیں کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ ہاں دربارِ خلافت کی طرف سے اس واقعہ کی اطلاع سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچائی گئی۔ اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ دربار کے سرکردہ مخالفین کے مارے جانے سے لوگ عبرت حاصل کریں اور آئندہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ دربارِ خلافت کو اس معاملے میں بے گناہ ظاہر کیا جائے اور سارا الزام سرکردہ مخالفوں پر ٹھوپ کر انھیں شریکِ مذموم قرار دیا جائے اور

مخالف تحریک کے سربراہ حسین بن علیؑ کو جھوٹا اور باطل پرست بتایا جائے صرف دربارِ خلافت اور اس کے حامی ہی نہیں اس وقت کے عام مسلمانوں کی اکثریت بھی اس واقعہ کو قاتلانِ حسینؑ کی کامیابی ہی تصور کرتی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ ان لوگوں کی شہادت کے بعد اب نہ اہل بیتؑ ہیں سے کسی کو مخالفت کی جرأت ہوگی اور نہ کسی اور کو اور شہادتِ امامؑ کا زخم رفتہ رفتہ خود ہی مندمل ہو جائے گا۔

یہ لوگ اس سانحہ کی روح سے ناواقف تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معرکہ حق و باطل کی عظمت و تاثیر میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس وقت صرف اہلبیتِ عصمت ہی کے چند افراد ایسے تھے جو اس واقعہ کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے، تاریخِ اسلام پر اس کا جو اثر مرتب ہونے والا تھا اس کے متعلق گفتگو کر سکتے تھے اور ایک حد تک لوگوں کی غلط فہمی دور کر سکتے تھے۔ یہی چند افراد تھے جو دربارِ خلافت کی خام خیالی کا پرہہ چاک کر سکتے تھے اور لوگوں کو توجہ دلا سکتے تھے کہ ان شہیدوں نے جو آج اپنی قبروں میں آرام کر رہے ہیں، دشمن کو کیا زک پہنچائی ہے اور ان کے یہ سر جو آج نیزوں پر چڑھا دیے گئے ہیں، کل تاریخ میں تہلکہ مچائیں گے۔ یہی افراد قیدی کی حیثیت سے اس شہر سے اُس شہر اور اس بستی سے اُس بستی گئے اور لوگوں کی سوچ بدل دی اور مقدس شہیدوں پر جو الزامات لگائے جا رہے تھے ان کی اس طرح صفائی پیش کی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

## سائخہ کر بلا کیوں بھلا یا تہہ جاسکا؟

یہاں اس سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخر امام حسینؑ کی شہادت نے اسلامی تاریخ میں مرکزی حیثیت کیوں اختیار کر لی۔ دوسری تمام دینی تحریکوں اور شہادت کے دوسرے واقعات کو مجموعی طور پر بھی وہ عظمت حاصل نہیں جو تحریک کر بلا کو ہے۔ یہی سائخہ تاریخ اسلام کے تمام سائخوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ غزوہٴ احد جو شوال ۳ہ میں مدینہ کے قریب پیش آیا اس میں ایک طرف رسولؐ خدا اور مسلمان تھے اور دوسری طرف مشرکین مکہ۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر چالیس صحابہ کے ایک دستے نے رسولؐ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمان دشمن پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد یکایک شکست سے دوچار ہو گئے۔ اسی سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ بیشتر شہداء کی لاشوں کا اس طرح مُثلہ کیا گیا کہ پہچانا مشکل ہو گیا۔ ایک بہن نے اپنے بھائی کی لاش انگلی کے نقص کی وجہ سے پہچانی لیکن اس سب کچھ کے باوجود غزوہٴ احد میں ستر سے اسی تک مسلمانوں کی شہادت کے واقعہ کو وہ عظمت حاصل نہ ہو سکی جو سائخہ کر بلا کو ہوئی۔ شہدائے فتح کے واقعہ کو لیجیے۔ اس میں آل رسولؐ میں سے متعدد افراد عباسی خلیفہ ہادی کے زمانے میں مکہ معظمہ کے قریب شہید ہوئے۔ اسی طرح حسنی سادات میں سے سولہ افراد کی شہادت کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ کوفہ کے قریب ہاشمیہ کے قہر خانے میں منصور دوانیقی کے حکم سے قید کیے گئے تھے اور وہیں یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ منصور نے یہ اجازت بھی نہیں دی کہ ان کا مردہ ہی دفن کر دیا جائے۔

جب سب مرچکے تو اس نے حکم دیا کہ قید خانے کی چھت اولادِ رسول کے لاشوں پر  
گرا دی جائے۔ نہ غسل، نہ کفن، نہ گورنہ گر ٹھا۔

تہ خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے

مر کے شرمندہ قاتل نہیں ہونے پاتے

اسی طرح اسلامی تاریخ کے اور بھی دردناک واقعات ہیں لیکن ان میں  
سے کوئی واقعہ بھی حادثہ نہ کہ بلا کی جگہ نہیں لے سکتا اور ان شہیدوں میں سے  
کوئی بھی امام حسینؑ نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ کے چچا حضرت حمزہؓ غزوہٴ اُحد میں  
شہید ہوئے۔ رسول اللہ نے انہیں سید الشہداء کا لقب عطا کیا تھا۔ ان کے نام  
میں بھی وہ اثر نہیں جو امام حسینؑ کے نام میں ہے اور نہ اسکی توقع ہی کی جاسکتی ہے۔  
ہم اس موقع پر اس سوال کا مکمل اور جامع جواب تو نہیں دینا چاہتے اور  
نہ شاید دے سکتے ہیں لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کے سربراہ کی خود  
اپنی شخصیت سے قطع نظر اہم ترین سبب جس کی وجہ سے حسینی تحریک کو دیکر  
تمام تحریکوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہو گئی وہ ڈراما تھا جو دشمن نے امام  
اور ان کے اصحاب کی شہادت کے فوراً بعد بڑے شوق سے کھیلا اور یوں  
نادانستہ طور پر اپنے لیے ذلت و رسوائی کا سامان مہیا کیا۔ اسی کے نتیجہ میں دنیا کو  
اس واقعہ کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہی ہوئی۔ اس واقعہ کی اہمیت کو  
روشناس کرانے میں اسی برانِ اہلبیتؑ کا بھی حصہ تھا اور قاتلانِ حسینؑ کا بھی  
دشمنوں نے شہداء کی شہادت اور جنگ کے خاتمے کے بعد یہودگی میں کوئی  
کسر نہیں چھوڑی۔ کیا کچھ نہیں کہا گیا؟ شہداء کے لاشوں کو برہنہ کر دیا۔ ان  
کے بدن پر سے کپڑے لوٹ کر لے گئے۔ نیچوں میں گھس کر اہلبیتِ عصمت کا

سامان لوٹ لیا۔ خیموں کو آگ لگا دی۔ عابد بیمار کو لیٹر پر قتل کرنے کی کوشش کی۔ لاشوں کو گھوڑوں کے سموں تلے روندنا۔ سروں کو نیزوں پر چڑھایا۔ غم زدہ اسیروں کے ساتھ سختی کی۔ امام کے لب و دندان پر فچیاں ماریں۔

ان یہودیوں سے دشمن کا اپنا ہی نقصان ہوا۔ لوگوں کو حقیقت کا پتا چل گیا۔ یہ یہود گیاں کر بلا سے شروع ہوئیں اور قافلے کے شام پہنچنے تک جاری رہیں۔ خود بزید نے ان میں حصہ لیا اور اپنے مقدر کی رسوائی سمیٹی۔

اہل بیتؑ نے کمالِ متانت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ لوگ انہیں شکست خوردہ سمجھتے تھے لیکن وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی کامیابی اور دشمن کی رسوائی کی بات کی۔ لوگ دشمن کو کامیاب سمجھتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ کامیابی اور سرخروئی تو ہمیں حاصل ہوئی ہے اور مزور دشمن کے حصے میں تو صرف نامرادی اور روسیاهی آئی ہے۔ لوگوں کی توقع کے برخلاف انھوں نے اعلان کیا کہ بنی امیہ کا جلد ہی زوال ہو جائے گا۔

اگر ابن سعد اور ابن زیاد چاہے مصلحتاً ہی سہی امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے بعد اہل بیتؑ کا احترام کرتے، ان سے اظہارِ مہمردی کرتے، شہداء کی تدفین میں مانع نہ ہوتے بلکہ انھیں خود اپنے مقتولین سے پہلے دفن کرتے، اہل بیتؑ کو عزت و احترام کے ساتھ کربلا ہی سے مدینہ منورہ بھیج دیتے اور وہ واقعات پیش نہ آتے جن میں ایک طرف دشمن نے یہودگی کی انتہا کر دی اور دوسری طرف اہل بیتؑ نے نہایت متناظر کن انداز میں ان کا پر وہ چاک کیا، تو شہادتِ امامؑ اور حادثہ کربلا کی یہ تصویر دنیا کے سامنے نہ آتی نہ ہی دشمن اس قدر ذلیل و رسوا ہوتا۔ یہ بھی خدا کا کرنا تھا کہ دشمن خود آزادی فکر و عمل کا پرچار کرنے والوں

کو قید کر کے لے گیا۔

ہمیں کو حیرتِ اظہار کا سلیقہ ہے  
صدا کا قحط پڑیگا تو ہم ہی بولیں گے

جب اہل بیتؑ کو شہر بہ شہر پھرایا گیا تو انہیں موقع مل گیا کہ وہ ہر جگہ کے لوگوں کے سامنے اپنا تعارف کرا میں۔ حادثہ رکرا کے متعلق گفتگو کریں اور اپنے جدِ امجد رسولؐ خدا سے اپنی قرابت کا اظہار کریں۔ اہل بیتؑ کو اظہارِ خیال کرنے کا پہلا موقع ۱۳ محرم کو ملا۔ اس روز وہ کوفہ پہنچے۔ شہر کو دیکھ کر ان کے دل بھڑکے کیونکہ امام علیؑ کے دورِ خلافت میں ان کا بیشتر وقت اسی شہر میں گزرا تھا۔ امیر المؤمنینؑ کی بیٹیوں ۱۴ھ میں اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ کوفہ سے مدینہ گئی تھیں۔ اب بیس سال بعد اس شہر میں وہ قیدی کی حیثیت سے لائی گئیں جہاں چار سال کے قریب انھوں نے حکومت کی تھی۔ ان ہی اہل عراق نے جو جمل، صفین اور نہرمان کی جنگوں میں امیر المؤمنینؑ کے یار و مددگار تھے، ان کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا اور ان کی باقی اولاد کو قیدی بنا لیا تھا مگر اہل بیتؑ کے خطیبوں نے، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی مقصد کے لیے مدینہ سے عراق آئے ہیں اور لوگ کوچہ و بازار میں ان کی تقریر سننے ہی کے لیے جمع ہوئے ہیں، پہلے ہی دن یعنی بارھویں محرم سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے ہر شخص سے گفتگو کی، جب بازار میں بات نہ کہنے کا موقع نہ رہا تو انھوں نے ابن زیاد کی مجلس میں اپنا کام جاری رکھا، اگرچہ اس کی صورت صرف یہ تھی کہ وہ ابن زیاد کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ اسی کے بعد وہ کوفہ کے قید خانے میں واپس آگئے لیکن ان کی دلیرانہ گفتگو اور بے نظیر خطیبوں نے لوگوں کے سینوں میں گھر

کر لیا، دل ہلا دیے اور لوگوں کی رائے بدل دی۔ لوگ روتے تھے اور اپنی غلط فہمی کا اعتراف کرتے تھے۔ لوگوں کا احساس بیدار ہوا تو ان پر اس تحریک کی قدر و قیمت عیاں ہو گئی۔ اس طرح دشمن کی سانحہ کر بلا کو غلط رنگ دینے کی کوشش خاک میں مل گئی۔ یہ سانحہ اپنی اصل صورت اور حقائق کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا۔ اہل بیتؑ کی تشنگی اور دشمن کا مکینہ پن تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔ تاریخ سے اصحاب و انصار ان حسینؑ کے بلند حوصلوں کا بخوبی پتا چلتا ہے حضرت علی اکبر کا یہ فقرہ بھی تاریخ میں درج ہے کہ جب ہم حق پر ہیں تو موت کا کیا خوف!

حضرت قاسمؑ کا یہ جملہ بھی تاریخ کی زینت ہے کہ میرے لیے موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

مسلم بن عوسجہ کا خلوص اور ان کا انداز گفتگو اس فقرے میں سمویا ہوا ہے کہ اگر ہم آپؑ کا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ خدا کی قسم جب تک دم میں دم ہے آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ آپؑ پر اپنی جان قربان کر دوں گا اور آپؑ کے سب ساتھیوں سے پہلے مارا جاؤں گا۔

سعید بن عبداللہ صنفی کو امامؑ نے چلے جانے کی اجازت دیدی۔ ان کی دبیری اور حوصلے کی بلندی اس فقرے سے عیاں ہے۔

بخدا اگر میں مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوں اور پھر آگ میں جلا یا جاؤں اور پھر میری راکھ ہو میں اڑا دی جائے اور ستر دفعہ بھی ماجرا پیش آئے تب بھی میں آپؑ سے جدا نہیں ہوں گا اور اسی راہ میں شہید ہو جاؤں گا۔



بشر بن عمر و حضرمی کے نام کو اس فقرے نے شہدائے اسلام کی تاریخ میں  
زندۂ جاوید بنا دیا:

صحرائی درندے میری بوٹیاں نونج نونج کرکھائیں، اگر میں آپ سے جدا  
ہوں اور دوسروں سے آپ کا حال پوچھتا پھروں۔ اس تنہائی اور بے کسی کے  
وقت میں آپ کا ساتھ کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ انھوں  
نے اپنی سعادت مندی کا اظہار اس طرح کیا:

کیا یہ ممکن ہے کہ فرزندِ پیغمبر کو دشمن کے ہاتھ میں گرفتار چھوڑ کر اپنی جان  
بچانے کی فکر کروں۔ خدا وہ دن نہ لائے۔

دوسرے شہدائے بزرگوار کے یہ جملے جن سے ان کی بے نظیر عظمت و شجاعت  
اور اخلاص و استقامت کا اظہار ہوتا ہے، تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

عمر بن قرظہ انصاری نے آخری دم کہا: اے فرزندِ رسول! کیا میں نے  
حق و فاداکر دیا اور اپنا فرض انجام دیدیا؟ جس وقت مسلم بن عوسجہ اسدی نزع  
کے عالم میں تھے، حبیب بن مظاہر اسدی نے ان سے کہا: مسلم! مبارک ہو، تم  
سے پہلے جنت میں جا رہے ہو۔

مسلم بن عوسجہ نے زمین پر تر پڑتے ہوئے جواب دیا: حبیب! میں تو جا رہا  
ہوں، مگر تم امام کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

ابو ثمامہ صائدی نے ظہر کے قریب امام حسینؑ سے کہا: کتنا اچھا ہو کہ  
شہادت سے پہلے ہم ظہر کی تمازا آپ کے ساتھ پڑھ لیں۔

بنا کر دند خوش رسمے بجاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اگر وہ تقریریں نہ ہوتیں جو شام میں کی گئیں اور اگر امام حسینؑ کے فرزند اور ان کی بہن کو ابن زیاد اور بزدلی کی مجالس میں گفتگو کا موقع نہ ملتا تو یہ بہت مشکل تھا کہ امامؑ اور آپ کے اصحاب کی شہادت کا واقعہ موجودہ شکل میں تاریخ کے صفحات پر آسکتا اور اس میں کوئی رد و بدل اور پیر پھیر نہ ہوا ہوتا۔ اب تو وہ فقرہ بھی تاریخ میں درج ہو گیا جو ایک حبشی غلام نے امامؑ سے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا: مجھے شہادت سے محروم نہ کیجیے اور اس سیاہ چہرے کے باوجود سرخ رو ہونے دیجیے۔ واقعی تاریخ کا کم ہی کوئی باب ہوگا جو اس طرح بغیر کسی کمی بیشی اور بغیر کسی رد و بدل کے مؤرخوں نے درج کیا ہو اور جس کی اکثر تفصیلات پر مؤرخوں کا اتفاق ہو۔ یہ تحقیق سے کہا جاسکتا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت تاریخ کا ایک روشن ترین اور بے نظیر ترین باب ہے۔ آج تک کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اس واقعہ میں کوئی پیر پھیر کر سکے۔ شیخ مفید ہوں یا طبری یا ابوالفرج اصفہانی، سب ہی نے اس واقعے کی تفصیلات ایک ہی طرح لکھی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ دشمن سخت غلط فہمی میں مبتلا رہا اور اس نے نادانانہ طور پر خود اس بات کا موقع فراہم کیا کہ امیر ابن اہلبیتؑ جو اس حادثے کے عینی شاہد تھے اور کسی دوسرے سے بہتر اس کی تفصیلات پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ پہلے عراق کے صدر مقام کوفہ میں پھر شام کے صدر مقام دمشق میں اور پھر حجاز کے صدر مقام مدینہ میں اس کے بارے میں گفتگو کریں۔ امام زین العابدینؑ نے ایک دن کوفہ کے بازار میں، پھر ایک دن دمشق کی جامع مسجد میں اور کچھ مدت بعد مدینہ میں اس حادثہ کا جمعہ کی اس طرح تصویر کشی کی کہ لوگوں پر حقیقت اس طرح عیاں ہو گئی کہ گویا وہ خود

روزِ عاشورا سرزمینِ نینوی میں موجود تھے۔

آخر ایک دن یزید اس صورتِ حال پر بچھتا یا اور اس کی سمجھ میں آگیا کہ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر کوفہ اور شام لانا کیسی حماقت تھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ شہادت پر ہی قصہ ختم کر دیا جاتا، ایک اور جھگڑا کھڑا نہ کیا جاتا اور اہل بیتؑ کو بازاروں اور عام محفلوں میں گفتگو کا موقع نہ دیا جاتا لیکن اب بچھتانے سے کیا ہوتا تھا! تیرکان سے نکل چکا تھا۔ ہونٹوں سے نکلی بات کو سینوں میں واپس تو نہیں لوٹایا جاسکتا تھا اور نہ وہ منظر جو لوگوں نے دیکھے تھے اور جو خطبے سنے تھے ان کے ذہنوں سے محو کیے جاسکتے تھے۔ جو لوگ بازاروں میں نالہ و فریاد کر چکے تھے انھیں دوبارہ کیسے باور کرایا جاسکتا تھا کہ وہ فرزندانِ پیغمبر جن کی شان میں ایسے تطہیر نازل ہوتی تھی، باغی، فتنہ جو اور کشتنی و گردن زنی ہیں۔ عام لوگوں پر حیب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اسے چھپاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی کو معلوم ہو کہ ان پر کیا گزری ہے لیکن اہل بیتؑ عصمت و طہارت نے پوری کوشش کی کہ جو بیتان پر پڑی تھی اس سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ اس مقصد سے انھوں نے واقعاتِ عاشورا کی ہر موقع پر ایک ایک تفصیل بیان کی۔ خود امام حسینؑ جو انسانی اور اسلامی فضائل کا مجسمہ تھے عموماً شہید ہی کے لقب سے یاد کیے جاتے رہے۔

### کوفہ میں امام سجاد کا خطبہ

امام سجادؑ نے کوفہ میں لوگوں سے خطاب کیا اور خطبہ دیا۔ آپ نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے فرمایا:

اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے“

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

”ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کو خوشخبری  
دیں اور ڈرائیں“

یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو فاتحِ عالم بنا کر بھیجا ہے یا اس لیے  
بھیجا ہے کہ آپ اسلامی حکومت کے رقبے میں اضافہ کرتے رہیں۔

سورہ فرقان میں ارشاد ہے:

”ہم نے آپ کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر  
بھیجا ہے“

سورہ سبا میں فرمایا گیا ہے:

”ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ آپ  
ایمان لانے والوں کو خوشخبری دیں اور ایمان نہ لانے والوں کو  
خدا کے عذاب سے ڈرائیں“

اسی قسم کا مضمون سورہ فاطر اور سورہ فتح میں بھی ہے۔

سورہ جمعہ میں ہے:

”اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک  
رسول بھیجا جو اللہ کی آیتیں انہیں پڑھ کر سنا تا ہے، باطل عقائد اور  
اخلاقِ ذمیرہ سے پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے“

ان آیات میں اور ایسی ہی دوسری آیات ہیں جن میں فرائضِ نبوت کا  
ذکر ہے، مکتور کشتافی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ہر جگہ تعلیم و تربیت، ہدایت، نیکیوں

دین کو سمجھے اور جو اعتقاد رکھے، علی وجہ البصیرت رکھے۔ نہ کوئی چیز ہولے نفسانی سے بڑھائے اور نہ کوئی چیز از روئے نادانی کم کرے۔ اس حدیث شریف کی رو سے بندے کی بھلائی اور سعادت کی بنیاد یہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اسلامی تاریخ میں جتنے فتنے پیدا ہوئے اور جتنے ناقابل تلافی نقصان مسلمانوں کو پہنچے ان کی اصل وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں میں سے بہت سے دین شناس نہیں تھے اور ایسے لوگوں نے اپنے خیال میں تو دین اسلام کی خدمت کی مگر درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ خلفاء کے عہد میں بڑی تیز رفتاری سے فتوحات ہوئیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی شہر یا علاقہ فتح ہوتا تھا اور لوگ اسلام قبول کرنے لگے مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ نو مسلم، اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی تعلیمات سے بھی ساتھ ہی آگاہ ہو جائیں اور قرآن اس کے احکام اور اس کی اخلاقی تعلیم کو صحیح صورت میں سمجھ لیں۔ کشور کشائی اور سیاسی غلبہ اور چہرے اور لوگوں کو اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات کی قدر و قیمت سے واقف کرنا کچھ اور بات ہے۔ قرآن کریم میں جو آیات رسول اللہ کی شخصیت کے بارے میں ہیں ان میں سے کسی میں رسول اللہ کو کشور کشا نہیں کہا گیا ہے اور نہ کشور کشائی ان کے فضائل میں شمار کی گئی ہے۔ رسول اللہ کی دعوت و رسالت کا مقصد تو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ○  
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ○

اے نبی ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، عذاب سے ڈرانے والا اور سب کو اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا

عبداللہ انصاری سے روایت کیا ہے۔ زیارتِ اربعین میں صفوان کے وہ فقرے بہت مشہور ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

”میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ایک نور تھے، پدرانِ والا مقام کی پشت اور مادرانِ پاک کے رحم میں۔ جاہلیت کی نجاست نے آپ کو آلودہ نہیں کیا۔ شرک و کفر اور گمراہی کی تاریکی نے آپ کو اپنے کپڑے نہیں پہنائے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ دین کا ستون، مسلمانوں کے پیشنیاں اور مومنین کی پناہ گاہ ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ امام ہیں، نیکو کار، پرہیزگار، پسندیدہ، پاکیزہ، ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے فرزندوں میں سے ائمہ تقویٰ کی سداہدایت کا نشان، قابلِ اطمینان وسیلہ اور اہل دنیا پر حجت ہیں“

ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان دیندار ہو اور پوری لگن سے دین اور متعلقاتِ دین کی حمایت کرتا ہو لیکن پھر بھی دین شناس نہ ہو اور دین سمجھ کر بعض ایسی باتوں کا اعتقاد رکھتا ہو جن کا دین کی روح سے ذرا بھی واسطہ نہیں اور دین کے نام پر ایسے کام کرتا ہو جن کا مذہب نے قطعی حکم نہیں دیا اسی لیے اس حدیث کے مطابق جو سیوطی نے جامع الصغیر میں روایت کی ہے، رسول خدا نے فرمایا ہے: جس بندے کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ دنیا اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتی ہے اور اسے اپنے عیب دکھانی دینے لگتے ہیں۔ بظاہر حدیث کے پہلے جزو کا یہی مطلب ہے کہ اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے دین شناس بنا دیتا ہے تاکہ وہ

یہ سعادتمند بزرگ امام صادقؑ اور امام کاظمؑ کے اصحاب میں سے تھے۔  
 کئی بار امام صادقؑ کو مدینہ سے عراق لے گئے۔ امام ششم ان سے اونٹ کرائے  
 پر لیتے تھے۔ خود صفوان بھی امام کے ہمراہ جایا کرتے تھے۔ انھوں نے امام ششم  
 کی برکت سے امام علیؑ کی قبر کو پہچانا جو اس وقت غیر معروف تھی اور بیس  
 سال تک امیرالمومنینؑ کی قبر پر مجاور رہے۔ صفوان شیعہ بزرگوں میں سے ہیں۔  
 انھوں نے ائمہ طاہرینؑ سے روایات نقل کی ہیں۔ زیارت وارثہ، زیارت  
 عاشورا، دعائے علقمہ اور امیرالمومنینؑ کی ایک زیارت انہی سے مروی ہیں۔  
 شیخ طوسیؒ نے مصباح المستجد میں زیارت وارثہ صفوان ہی کے طریق سے  
 امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے زیارت عاشورا دو طریقوں  
 سے روایت کی ہے۔ ایک علقمہ بن جعفر حضرمی عن الامام محمد الباقرؑ اور  
 دوسرے صفوان جمال عن الامام الصادقؑ۔

صفوان بن سیف بن عمیر کہتے ہیں کہ میں امام صادقؑ کے ہمراہ تھا  
 کہ آپ نے یہاں اس طرح زیارت کی اور دعائے علقمہ پڑھی۔ خاص بات  
 یہ ہے کہ جو دعائے علقمہ کے نام سے مشہور ہے اور دعائے عاشورا کے  
 بعد پڑھی جاتی ہے وہ صفوان نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے نہ کہ علقمہ  
 نے امام باقرؑ سے اس لیے اس کو دعائے صفوان کہنا چاہیے۔ معلوم نہیں دعائے  
 علقمہ کے نام سے کیوں مشہور ہو گئی! اربعین امام حسینؑ کی بھی ایک زیارت انہی  
 صفوان نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے۔

دوسری زیارت اربعین وہ ہے جو جابر بن عبد اللہ انصاری نے امام کی  
 زیارت کے موقع پر پڑھی تھی۔ اسے عطیہ بن سعد بن جوادہ مخومی نے جابر بن

فرشتوں کا دین اور میرے آباء کا دین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دین خدا کے یہاں مقبول نہیں۔

حسن بن زیاد عطار نے بھی اپنے عقائد امام کو پیش کیے اور امام نے انکے عقائد کی توثیق فرمائی۔

جن لوگوں نے اپنے عقائد اپنے دور کے امام کو پیش کیے ان میں سے ایک صفوان بن مهران اسدی تھے جو ساربان تھے، اونٹ کرائے پر چلاتے تھے۔ انہوں نے اپنے عقائد امام صادقؑ کو پیش کرتے ہوئے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد خدا کے رسول ہیں۔ جب تک وہ تھے مخلوق پر رحمت تھے۔ ان کے بعد امیر المؤمنین علیؑ حجۃ اللہ تھے۔ امام نے کہا خدا تجھ پر رحمت کرے۔

صفوان نے پھر کہا: ان کے بعد حسن بن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے امام نے کہا: تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔

پھر کہا: اس کے بعد حسین بن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امام نے کہا: تجھ پر خدا کی رحمت!

صفوان نے کہا: پھر علی بن الحسینؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امام نے فرمایا: تجھ پر خدا کی رحمت!

کہا: پھر محمد بن علیؑ حجۃ اللہ علی الخلق تھے۔

امام نے کہا: تجھ پر خدا کی رحمت!

صفوان نے عرض کیا: اب آپ حجۃ اللہ علی الخلق ہیں۔

امام نے فرمایا: تجھ پر خدا کی رحمت!



علیؑ اور فاطمہؑ سے نسبی تعلق دین کی جگہ نہیں لے سکتا۔

عبداللہ بن ابی یعفور نے بھی اپنے عقائد امامؑ کو پیش کیے۔ اسی طرح عمر دین حریث نے اپنے عقائد امام موصوف سے بیان کیے تو انھوں نے فرمایا: یہی میرا اور میرے آباء کا دین ہے اور اسی عقیدے پر ہم ہر حال میں قائم ہیں۔ تقویٰ کا دامن کسی حال میں مت چھوڑو اور سوائے اچھی بات کے کوئی بات زبان سے نہ نکالو۔ یہ مت کہو کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مجھے ہدایت دی اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو۔

خالد بکلی بھی امام صادقؑ کے اصحاب میں سے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے عقائد امامؑ کو پیش کیے۔ جب ان کی تقریر طویل ہو گئی تو امامؑ نے فرمایا: بس چپ رہو، جو تم نے کہا وہ حق ہے۔

ایک اور صاحب یوسف نامی جو امامؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ انھوں نے بھی امامؑ سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے عقائد بیان کر دوں۔ اگر درست ہوں تو میں ان پر قائم رہوں۔ اگر کوئی عقیدہ حق کے منافی ہو تو میری اصلاح کر دیجیے۔

امامؑ نے فرمایا: کہو

یوسف نے کہا: میں خدا کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ علیؑ میرے امام ہیں، حسنؑ میرے امام ہیں، حسینؑ میرے امام ہیں، علی بن حسینؑ میرے امام ہیں، محمد بن علیؑ میرے امام ہیں اور اب آپ خود میرے امام ہیں۔ امامؑ نے کئی دفعہ کہا خدا تم پر اپنا فضل کرے جو تم نے کہا وہی خدا کا دین،

خلافِ دین ہو۔ انہی بزرگوں میں سے ایک عبدالعظیم حسنی ہیں جن کا سلسلہ نسب چار واسطے سے امام حسنؑ تک پہنچتا ہے۔ یہ امام محمد تقیؑ جو اڈا اور امام علی نقیؑ ہادیؑ کے جمعہ تھے اور خود ان کا شمار بزرگانِ اہلبیت اور علمائے اسلام میں ہوتا ہے۔ بہر حال یہ امام ہادیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے عقائد آپ کی خدمت میں پیش کروں اور اگر آپ ان کی توثیق فرمادیں تو میں ان پر قائم رہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عقائد پیش کیے۔ امام نے ان کے عقائد سن کر کہا کہ یہی وہ دین ہے جو خدا نے تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے لہذا تم ان عقائد پر ثابت قدم رہو اللہ تمہیں دنیا و آخرت میں حق پر قائم رکھے۔

واقعی حیرت کی بات ہے کہ عبدالعظیم حسنی کو اتنے جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا جب تک اپنے عقائد امام وقت کی خدمت میں پیش نہ کر دیے لیکن ایک عام شخص کو پورا اطمینان ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ وہی ہے جو رسول خداؐ خدا کی طرف سے لائے۔

حمران بن اعین امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے ممتاز اصحاب میں سے ہیں۔ امام باقرؑ نے ان سے کہا کہ تو دنیا و آخرت میں ہمارے شیعوں میں سے ہے۔ ان کا شمار قرأت، تفسیر، نحو اور لغت کے علماء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے عقائد امام صادقؑ کی خدمت میں پیش کیے۔ امام نے کہا کہ جو عقائد تم نے بیان کیے ہیں ان میں اگر کوئی تمہاری مخالفت کرتا ہے تو وہ بے دین ہے۔

حمران نے کہا: چاہے علوی و فاطمی ہو؟

امام نے فرمایا: چاہے محمدی و علوی و فاطمی ہو یعنی رسول خداؐ اور

تفسیر قرآن کے نام سے وہ باتیں لکھیں جو قرآن کی غرض و غایت کے خلاف تھیں۔ کیسے کیسے افسانے تاریخ کا جزد بن گئے اور کیسی کیسی عامیانہ باتوں کو مذہبی رسوم میں شمار نہیں کر لیا گیا اسی لیے تو ہم نے کہا ہے کہ ہر دیندار دین شناس نہیں ہوتا۔ دینداروں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ کوشش دین شناس بننے کی کریں تاکہ ان کے ہاتھوں دین کی اُبرد بھی محفوظ رہے اور دین کے نام سے جو کام وہ کریں اس سے خدا اور رسولؐ بھی راضی ہوں۔ دینی مراسم کا معاملہ انفرادی ذوق پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ جاہلانہ طریقوں سے رسولؐ خدا اور ائمہ طاہرینؑ کی زیارت کی رسوم ادا نہیں کی جاسکتیں۔

ایک خطرناک اور مذہب کے بالکل الٹ خیال یہ ہے کہ جو کام بھی مذہبی رنگ اختیار کر لے وہ اچھا اور ثواب کا کام ہے چاہے وہ دین کی روح کے منافی ہی کیوں نہ ہو اور اس دین کو لانے والے پیغمبر اس سے بیزار ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح جس رسم پر بھی امام حسینؑ کے مقدس نام کا ٹھپہ لگا دیا جائے اسے دنیا و آخرت کی سرخروئی کا باعث سمجھ لیا جاتا ہے چاہے انکی مقدس روح کو اس سے تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔ جو بات بھی منبر حسینؑ سے کہی جائے وہ موجب اجر و ثواب اور عبادت ہے چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو یا بعض افراد کی مدح و قدر ہی کیوں نہ ہو۔ انہی خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض بزرگان دین نے جو خود عالم اور اس بات کے اہل تھے کہ دوسروں کی تعلیم و تربیت کو سیکس پھر بھی اپنے عقائد اور مذہبی خیالات کو توشیح کی غرض سے اپنے دور کے امام کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایسی بات کے معتقد ہوں جو دین کے منافی ہو یا دین سمجھ کر کوئی ایسا کام کرتے ہوں جو

طرف سے مذہبی مراسم کی انجام دہی میں پوری کوشش کرتے ہیں لیکن چونکہ دین شناس نہیں لہذا عموماً ان کی کوششیں جاہلانہ اور عامیانہ ہوتی ہیں۔ کبھی ثواب کی نیت سے خدا سے لڑتے ہیں اور کبھی دین کی خاطر دین اور دینداروں پر حملہ کرتے ہیں اور کبھی اس ڈر سے کہ کافر نہ ہو جائیں دینداروں کو کافر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو رسول خدا حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول مانتا ہے مسلمان ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ ہر مسلمان یہ سمجھتا ہو کہ مسلمان کیا چیز ہے اور رسول خدا کی بعثت کا مقصد کیا تھا دعا اور زیارت کو کیسے انجام دینا چاہیے اور کونسے عمل خدا سے قریب کرتے ہیں بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص یا جماعت کے مسلمان یا دیندار ہونے کے باوجود فضیلت دین کے اٹھ ہوں یا کوئی توحید کے دعوے کے باوجود شرک کرتا ہو یا نام اخلاص کا لیتا ہو مگر ربا کا رہو اس لیے اگر کسی شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ دین کے خلاف کام کرتا ہے یا فلاں شخص یا فلاں گروہ کی سوچ دین یا قرآن کے خلاف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ شخص یا گروہ مسلمان یا دیندار نہیں۔ اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جنہوں نے نہایت نیک نیتی سے اور رضائے الہی کی خاطر دین کے خلاف قدم اٹھائے ہیں۔ درحقیقت یہ انکی سمجھ کا پھیر تھا۔ وہ اپنی دانست میں دین کی حفاظت بلکہ ترویج کے لیے کام کر رہے تھے لیکن ان کے قدم اٹے پڑ رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ قرآن کی ترویج اور اشاعت کے دلدادہ تھے لیکن انہوں نے قرآن کے خلاف کام کیے ہیں کتنے لوگوں نے دین کی خدمت کے خیال سے اپنی کتابوں میں غلط روایات اور من گھڑت افسانے لکھ دیے ہیں جن سے بہت سے مسلمان گمراہ ہوئے۔ کتنے ہی لوگوں نے

## روز اربعین

شہدائے کربلا کے چہلم کے موقع پر امام حسینؑ اور شہدائے واقفہ طف کی زیارت مستحب ہے۔ اسی لیے اربعین کے دن اطراف و اکناف سے آئے ہوئے شیعوں اور سنیوں کا کربلائے معلیٰ میں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ لوگ ان بزرگوں پر جنھوں نے حق پرستی اور جاننازی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کیا درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اپنی اپنی زبانوں میں اور اپنے اپنے الفاظ میں رسوم زیارت ادا کرتے ہیں اور اس بلند مقصد سے اپنی دل بستگی کا اظہار کرتے ہیں جو ان بزرگوں کو میدان شہادت میں کھینچ لایا تھا لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ دعا اور زیارت اسی طریقے سے پڑھی جائے جو رسولؐ خدا یا ائمہ طاہرینؑ سے منقول ہے اور دعا کے معانی میں ان دعاؤں کو تزییح دی جائے جو خود قرآن مجید میں آئی ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگ دُور دُور سے آکر امام شامن علی بن موسیٰ رضاؑ کے مہمظرہ کی زیارت سے شرفیاب ہوتے ہیں مگر مشہد مقدس میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں سوائے اس عامیانہ زیارت کے جو زیارت فروشوں نے بنائی ہوئی ہے اور کچھ نہیں پڑھتے اور ان تمام زیارتوں کی برکت سے محروم رہ جاتے ہیں جو ائمہ طاہرینؑ سے مروی ہیں۔

## ہر مسلمان اسلام شناس نہیں ہوتا

لوگ امام رضاؑ کو صرف غریب الغرباء کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لوگ دیندار ہونگے مگر دین شناس نہیں۔ دینداری اور چیز ہے دین شناسی اور چیز۔ یہ لوگ شب اور رسولؐ اور دین و مذہب پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنی

قرآن پڑھیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری کتاب کو نہ دیجیے۔ ہر روز قرآن کی تلاوت کی عادت ڈالیے۔ مقررہ کا تعین آپ کی اپنی سہولت پر منحصر ہے۔ حتی الامکان آیات کے ترجمے پر توجہ دیجیے۔ اگر عربی سمجھ میں نہیں آتی تو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دیکھیے۔ جب موقع اور فرصت ہو، ان آیات کے متعلق اپنے گھر والوں اور بیوی بچوں سے بھی گفتگو کیجیے۔ قرآن سے بیگانہ نہ رہنا اور قرآن کو نہ سمجھنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ قرآن پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے ہی کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے قرآن سے لگاؤ پیدا کریں۔ فضائل کی عادت ڈالیں اور رذائل اور برائیوں سے اجتناب کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت سے ثواب کا مطلب یہی ہے کہ اس سے روحانی تربیت ہوتی ہے جو اچھا کام کرتا ہے، اسے ثواب ملتا ہے یعنی روحانی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر نیک کام سے آدمی میں اخلاقی لحاظ سے کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اضافہ نہیں ہونا اور آدمی کچھ اوپر نہیں اٹھتا تو پھر ثواب کے کچھ معنی نہیں۔ اسی طرح گناہ کا یہ مطلب ہے کہ آدمی پہلے سے کچھ پست ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو گناہ کے کچھ معنی نہیں۔ ثواب کے کام وہ ہیں کہ جو اگر توجہ اور ارادے سے کیے جائیں تو آدمی پر اچھا اثر چھوڑیں، اس کی روحانی ترقی کا موجب ہوں، اچھی عادتوں کو باقی رکھیں اور بری عادتوں کو ختم کر دیں۔ گناہ کے کام وہ ہیں جو روح کو زنگ آلود کریں، برائیوں کو ترقی دیں اور اچھی عادتوں کو کمزور کریں۔

قرآن کی تلاوت پسندیدہ عمل ہے بشرطیکہ نیکوں میں اضافہ اور برائیوں میں کمی کا سبب ہو۔ نیکی کی عادت کو تقویت دے اور بری عادتوں کو ختم کر دے۔

وہی درجہ اور مقام حاصل ہوگا جس کا استحقاق اس نے دنیا میں پیدا کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مسلمانوں کو اسی لیے عطا کیا ہے کہ وہ اسے مقدس اور مہر کتاب سمجھیں، اس پر غور کریں اور اس سے استفادہ کریں۔

مسلمانوں کو دوسری ہر کتاب سے پہلے اور دوسری ہر کتاب سے زیادہ قرآن مجید سے لگا دیکھنا چاہیے۔ قرآن سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس پر عمل کرنے کی نیت سے اسے پڑھنا چاہیے۔

گناہ چھوڑ کر ہر روز اس نیت سے قرآن کی کچھ آیات تلاوت کیا کرے اور ان پر خوب غور کرے۔ اگر عربی نہیں جانتا تو ترجمہ دیکھے اور اپنے پروردگار کے کلام سے جس کی بڑی بری کوئی دوسرا کلام نہیں کر سکتا کسبِ فیض کرے۔ اگر درس آئینیں ثواب کی غرض سے پڑھتا ہے تو ایک آیت روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی پڑھ لے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی عمل انسان پر اچھا اثر نہ چھوڑے ثواب کا کچھ مطلب ہی نہیں۔ بہر حال ہر روز پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہیے۔ حتی الامکان اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہماری زبان میں بکثرت عربی کے الفاظ مستعمل ہیں اس لیے بہت تھوڑی کوشش سے قرآن مجید کے ترجمے سے مناسبت پیدا کی جاسکتی ہے۔ آج ہمارے تعلیمیاتہ لوگ عربی سے خوف کھاتے ہیں لیکن یہ ڈر اور رعب باسانی دور کیا جاسکتا ہے کسی چیز کا رعب اسی وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی اسے جانتا اور سمجھتا نہیں۔ اگر قرآن اور اس کے مفہوم سے مناسبت پیدا ہو جائے اور اس کے مواظف و محکم سے استفادہ کی عادت پڑ جائے تو پھر قرآن کی تلاوت میں بھی لذت محسوس ہونے لگے گی اس لیے

اگر پڑھا بھی جائے تو محض ثواب کمانے کے لیے سمجھنے کے لیے اور عمل کرنے کے لیے نہیں، یہ سب بے بنیاد اور خلافتِ مذہبِ بائیں ہیں۔ یہ قرآن میں غور و فکر اور اس سے استفادہ سے روکنا ہے۔ قرآن کی تلاوت کرنے اور آیاتِ قرآنی کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کہا ہے کہ قرآن میں غور و فکر کریں۔ ارشاد ہے:

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝

(سورہ محمّدہ آیت ۲۴)

دیکھا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

قرآن پر غور کیے بغیر کوئی اسے کیسے سمجھ سکتا ہے، کیسے اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے اور کیسے اسے دنیا و آخرت میں اپنا رہنما بنا سکتا ہے؟ امین الاسلام مرحوم نے اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمے میں رسول اللہ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جس شخص نے قرآن پڑھا اور سمجھا ہے اس سے قیامت کے دن حساب کے بعد کہا جائے گا: قرآن پڑھنا جابا اور ترقی کرتا جابا۔ جس طرح دنیا میں ترنیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور صحت کے ساتھ پڑھنا تھا، اب بھی پڑھ۔ جتنا قرآن پڑھے گا، اتنے ہی تیرے درجات بلند ہوں گے۔ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ جنت میں وہی قرآن پڑھے گا اور آیات کے شمار کے لحاظ سے جنت کے درجات ملے کرے گا جس نے دنیا میں قرآن کی تلاوت کی ہوگی اور ہر آیت کی تلاوت کے ساتھ روحانی، اخلاقی اور ایمانی بلندی حاصل کی ہوگی۔ جنت میں ہر شخص کو



اور ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ (اے لوگو!) یا ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ (اے ایمان والو!) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کا روئے سخن لوگوں کی طرف ہے، کبھی سب لوگوں کی طرف، کبھی خاص ایمان والوں کی طرف اور کبھی کافروں اور منافقوں کی طرف۔ قرآن وہ کتاب ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اسلام بھی تمام بنی نوع انسان کا مذہب ہے البتہ کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے اور وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور کچھ لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ اگر کچھ لوگ خدا کو نہیں مانتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا صرف ان کا خدا ہے جو اسے مانتے ہیں اور دیندار ہیں۔ وہ سب مومنوں اور کافروں کا خدا ہے۔ سب موجودات و ممکنات کا خدا ہے۔ قرآن بھی تمام بنی نوع انسان کے لیے نازل ہوا ہے۔ تمام اہل عالم اس کے مخاطب ہیں۔ وہ بھی جو اسے آسمانی کتاب مانتے ہیں اور وہ بھی جو نا سمجھی یا ضد سے اسے نہیں مانتے۔ رسول خدا بھی تمام انسانیت کے پیغمبر ہیں۔ ان کے بھی جو اخیلیق پیغمبر مانتے ہیں اور ان کے بھی جو اخیلیق پیغمبر نہیں مانتے۔ اسی طرح امام علی بن ابی طالب اور دوسرے گیارہ امام اپنے اپنے دور میں تمام بنی نوع انسان کے امام ہوئے۔ امام زمان آج تمام بنی نوع انسان کے امام اور حجت الہی ہیں، ان کے بھی جو ان کی امامت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے بھی جو کسی بھی وجہ سے ان کی امامت کے مفیدے سے محروم ہیں۔ بہر حال یہ سمجھنا کہ قرآن تمام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے یا صرف تبرک کے طور پر گھڑیں رکھنے کے لیے ہے یا

”بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے اپنا حق ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے۔“ (سورہ مطففین - آیات ۴ تا ۷)

تو کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس آیت کا مطلب نہیں سمجھے، چلو رسول اللہ سے پوچھیں کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ قرآن مجید میں ایسی صریح اور روشن آیات ہیں کہ مسلمان انھیں تلاوت کر کے اور ان کے معنی پر غور کر کے ان سے سبق لے سکتے ہیں اور نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت یا اس کا ترجمہ جو بھی پڑھے گا، یہی سمجھے گا کہ خدا ایسے لوگوں کو عذاب کی وعید دے رہا ہے جو کوئی چیز بیچتے وقت کم ناپتے اور کم تولتے ہیں۔ دوسروں کا حق کم کر کے دیتے ہیں اور اپنا حق پورا لینا چاہتے ہیں۔

خدا کتنا ہے کہ ایسے لوگ گویا روز جزا پر یقین نہیں رکھتے اور اس دن سے بے خبر ہیں جب پروردگار کے حکم سے سب حساب کے لیے بلائے جائیں گے۔ قرآن مجید وہ کتاب ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ہدایت سے استفادہ کریں اور اسے اپنی روحانی و اخلاقی بیماریوں کا بہترین علاج سمجھیں۔ البتہ قرآن مجید میں کچھ آیات منشاہات ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء بھی ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں ایسی آیات کے لیے رسول خدا اور ائمہ ظاہرین کی بیان کی ہوئی تفسیر سے استفادہ ضروری ہے لیکن قرآن کی سب آیات کی یہ بات نہیں۔ بیشتر آیات بالکل واضح ہیں

لوگوں پر ظاہر کر دیں اور وہ خود ان پر غور کریں۔“

آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو دد کام کرنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول خدا سے جو تفسیر ان تک پہنچے اسے سیکھیں اور یاد کریں۔ قرآن کی جو آیات تشریح کی محتاج ہیں ان کو رسول اللہ کی بیان کی ہوئی تفسیر کی مدد سے سمجھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو محکم آیات صاف اور واضح ہیں ان میں بھی رسول اللہ کی تفسیر کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ نے قرآن کا کوئی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ مراد وہ آیات ہیں جن کی تفصیل اور توضیح کی ضرورت ہے جن کا کوئی کچھ مطلب لیتا ہے اور کوئی کچھ۔

مسلمانوں کا دوسرا فریضہ جس کی اس آیت میں تشریح ہے یہ ہے کہ خود بھی قرآن مجید سے استفادہ کریں اور اس کو سمجھنے میں اپنی عقل استعمال کریں رسول خدا جو قرآن کی تشریح اور تفسیر کرتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان قرآن کا مطلب سمجھنے سے محروم کر دیے گئے اور انہیں چاہیے کہ اس آیت کا مطلب بھی رسول اللہ سے پوچھیں

”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَائِي ذِي الْقُرْبَىٰ“

اس آیت کا مطلب تو اتنا صاف اور واضح ہے کہ جسے عربی سے ذرا بھی واقفیت ہو وہ اسے سمجھ سکتا ہے، اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اس آیت کا سولے اس کے کچھ مطلب نہیں سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ انصاف کریں، ظلم سے کام نہ لیں، نیکی کریں اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت و مہربانی سے پیش آئیں۔ اس طرح جب مسلمانوں کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی تھی:

پڑھتے رہے ہیں۔ وہ انکے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تین مرتبہ تفسیر پڑھی اور قرأتِ قرآن کے ستر دور کیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دو درس تھے۔ ایک میں وہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تھے اور دوسرے میں محض قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ عظیمہ نے پہلے درس کے تین اور دوسرے کے ستر دور مکمل کیے۔

## مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں

اس روایت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحابہ و تابعین تفسیر قرآن اور تلاوت قرآن کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور علم تفسیر اور تلاوت قرآن کے کتنے شیدائی تھے۔ یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی دین و دنیا کی کامیابی اور فلاح قرآن ہی کے زیر سایہ ہے۔ قرآن اسی لیے نازل ہوا ہے کہ مسلمان ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہیں اور اس کے مطالب پر غور کریں۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں اس کی تصریح ہے کہ مسلمانوں کو دو کام کرنے چاہئیں، ایک تو یہ کہ قرآن کی تفسیر رسول خدا سے سیکھیں اور دوسرے یہ کہ خود بھی قرآن سمجھنے کی کوشش کریں اور اس پر غور کریں۔

سورۃ نحل آیت ۴۴ میں ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ  
إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○

”ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے تاکہ آپ اس کے معنائیں

عطیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ عطفیہ نے سائہ میں عبدالرحمن بن محمد بن اشعث کی ہمراہی میں عراق کے سفاک گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کے خلاف جہاد کیا۔ ۸۵ھ میں عبدالرحمن کے مارے جانے کے بعد عطیہ بھاگ کر ایران چلے گئے۔ حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو لکھا کہ عطیہ کو حاضر کر کے اس سے کہو کہ علی پر لعنت کرے، اگر انکار کرے تو اس کے چار سو کوڑے لگاؤ اور اس کا سر اور ڈاڑھی مونڈ دو۔ محمد بن قاسم نے عطیہ کو بلوایا اور حجاج کی چشمی پڑھ کر سنائی۔ عطیہ علیؑ کی بدگوئی پر تیار نہیں ہوئے اور امیر المومنین کی شان میں گستاخی سے صاف انکار کر دیا۔ چار عطیہ اس پر تیار ہوئے کہ انہیں حجاج کے حکم کے مطابق چار سو کوڑے لگائے جائیں اور سر اور ڈاڑھی مونڈ دی جائے۔ جب قتیبہ بن مسلم خراسان کا حاکم ہوا تو عطیہ وہاں چلے گئے اور وہیں رہتے رہے۔ آخر جب عمر بن مہدیہ عراق کا والی ہوا تو عطیہ نے اسے خط لکھا اور عراق واپسی کی اجازت مانگی۔ عمر نے اجازت دے دی۔ عطیہ کو قہر چلے گئے اور وہیں رہتے رہے یہاں تک کہ ۱۱۱ھ میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد طبری نے لکھا ہے کہ عطیہ کثیر الروایت اور ثقہ تھے۔

طبقات ابن سعد جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۱ میں بھی یہ قصہ اسی طرح مذکور ہے۔ اتنا

اضافہ ہے کہ عطیہ کی ماں ایک رومی کنیز تھی۔

عطیہ احادیث کے راوی اور مجاہد اسلام ہونے کے علاوہ ایک بڑے مفسر بھی تھے! انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر پانچ جلدوں میں لکھی تھی۔

بلاغات النساء کی روایت کے مطابق فدک کے بارے میں صدیقہ طاہرہؑ کا خطبہ عبد اللہ محض یعنی عبد اللہ بن حسن بن حسنؑ سے روایت کرتے تھے عبد اللہ محض کے والد حسن ثقفی امام حسنؑ کے بیٹے تھے اور ان کی والدہ فاطمہ امام حسینؑ کی صاحبزادی تھیں۔ عطیہ کچھ عرصے ابن عباسؑ سے

دی۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ جابر بن عبد اللہ انصاریؓ جو بعض اقوال کے مطابق دونوں آنکھوں سے نابینا ہو چکے تھے، زیارتِ امام کے قصد سے فوراً ہی کرہلا روانہ ہو گئے ہوں اور ۲۰ صفر کو ٹھیک شہادتِ امامؑ سے چالیس روز بعد وہاں پہنچے ہوں اور انہی سے زیارتِ اربعین کی سنت کی ابتدا ہوئی ہو۔ جابرؓ اس سفر میں تنہا نہیں تھے۔ ان کے ہم سفر ایک اور بزرگ تھے جو ستر سال کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں جوان تھے غلطی سے بعض لوگوں نے انھیں جابر کا غلام کہا ہے۔ درحقیقت یہ بڑے باعزت شخص تھے لیکن دوسرے حقائق کی طرح ان کی شخصیت کو بھی بہت سے مذہبی حلقوں میں بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفی کوئی تھے جو ایک بزرگ تابعی تھے یعنی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے رسولِ خدا کو تو نہیں البتہ اصحابِ رسولؐ کو دیکھا تھا اور ان سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ ان میں عبد اللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے۔

مورخ طبری نے کتاب منتخب ذیل المذیل میں لکھا ہے کہ عطیہ بن سعد بن جنادہ کا تعلق قبیلہ رقیس کے خاندانِ جدیلہ سے تھا۔ ان کی کنیت ابوالحسن تھی۔ اس کے بعد اس مضمون کی روایت بیان کی ہے کہ عطیہ کے باپ سعد بن جنادہ کو فہ میں امام علی بن ابی طالبؑ کے پاس آئے اور کہا:

امیر المؤمنین! خدا نے مجھے بیٹا دیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر اس کا نام تجویز کر دیجیے۔ امام علیؑ نے کہا: "هَذَا عَطِيَّةُ اللَّهِ"۔ یہ اللہ کی دین ہے اس جملے میں امیر المؤمنینؑ نے نام بھی تجویز کر دیا چنانچہ عطیہ نام رکھا گیا۔ طبری نے

## ضمیمہ

### جابرؓ اور عطیہؓ کی کربلا میں آمد

شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب مصباح المتہجد میں لکھا ہے کہ ۲۰ صفر وہ دن ہے کہ جب جابر بن عبد اللہ انصاریؓ مدینہ سے امام حسینؑ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے کربلا آئے، وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قبر امامؑ کی زیارت کی۔ اس روز امام حسینؑ کی زیارت مستحب ہے یہی زیارت اربعین ہے۔ طوسیؒ کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جابرؓ مدینہ سے زیارت کے لیے روانہ ہو کر ۳ صفر کو کربلا پہنچے اور یہ بات کچھ بعید بھی نہیں کیونکہ اہلبیتؑ کے کوفہ پہنچنے کے فوراً بعد ابن زیاد نے عبد الملک بن ابی حارث سلمیٰ کو عراق سے حجاز بھیجا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے مدینہ پہنچ کر عمرو بن سعید بن عاص اموی والی مدینہ کو امامؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی اطلاع دے۔ عبد الملک فوراً ہی مدینہ روانہ ہو گیا اور چند روز بعد وہاں پہنچ کر والی مدینہ کو باصنا بطہ اطلاع

نہیں ہے۔ وہ مردانِ مخلص و بے ریا کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ نہ خفائق کو چھپاتی ہے نہ کسی کی بزرگی و پاکدامنی پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ جب تک تاریخ کی شہادت موجود ہے، سید الشہداء، امام حسینؑ کی طہارت و عصمت، ان کے ایمان و تقویٰ اور ان کی دینداری و خداپرستی میں شک کی گنجائش نہیں اور نہ ان کے دشمنوں کی ستمگری و خودپرستی پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ یا وہ کوڑوں اور لغو نو بیوں کے قسملے اور زبان کتنے ہی افسانے تراشیں تاریخ کا قطعی اور محکم فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا۔ جہاں شک ہو وہ اسی محکم فیصلے کی روشنی میں دور کیا جاسکتا ہے۔

قریب قریب موجِ نوح بیکر پھری ہے یوں شفق  
 جیسے سورج کے تعاقب میں پھرے دور فلک  
 طلعتِ شبنم نے چیرے ہیں لاکھوں شبِ کدرے  
 تب کہیں پہنچا ہے سورج کربلا کی صبحِ تنگ



امامؑ کے الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات پر اظہارِ رنج و الم کرنا چاہتے تھے نہ لوگوں کو متاثر کرنا مقصود تھا۔ ان کے مد نظر مختصر جملوں میں دشمنانِ اہل بیتؑ کو شرمندہ کرنا اور ان کے مظالم کو بے نقاب کرنا تھا۔ پھر چند جملوں کے بعد آپ نے فرمایا:

”لوگو! ہمارے ساتھ کافروں اور مرتدوں کا سا سلوک کیا گیا ہے حالانکہ ہم نے نہ کوئی گناہ کیا تھا نہ کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے اور نہ ہم نے اسلام سے بے وفائی کی تھی۔ بخدا اگر رسولِ خدا نے ہمارے خلاف جنگ کا حکم دیا ہوتا تو یہ لوگ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرتے۔“

امامؑ کا خطبہ ختم ہوا تو اہل بیتؑ عصمت و طہارت اپنے گھروں کو آگئے۔ انھوں نے راہِ حق میں ثابت قدمی اور جاں بازی کا اعزاز ہمیشہ کے لیے حاصل کر لیا تھا۔ ان کے دشمنوں کا نام ظالموں اور جاہلوں کی فہرست میں درج ہو چکا تھا۔ ان کا اعزاز اور دشمن کی بدنامی تاریخ کا حصہ بن چکے تھے نہ کوئی تاریخ کو مسخ کر سکتا ہے نہ بنی ہاشم کی نیک نامی کو مٹا سکتا ہے اور نہ غیروں کی رسوائی اور بدنامی کا داغ دھویا جاسکتا ہے۔ اہلبیتؑ کی گفتگو اور تقریریں جو انھوں نے مدینہ سے مکہ، مکہ سے عراق، عراق سے شام، شام سے مدینہ تک کیں، تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں کہ تاریخ کا چہرہ مسخ کر دیا جائے۔ شہیدانِ راہِ خدا اور باطل پرستوں کے کردار گڑبگڑ کر دیے جائیں۔ نیک نامی کا جامہ جانباڑوں کی بجائے ستم گروں کو پہنا دیا جائے۔ فضائل سے عاری لوگوں کو تاریخ میں جوال مردو جانباڑ کے روپ میں پیش کیا جائے۔ تاریخ ہاشمی

۷ عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال  
صد سال می تو ان بہ تمنا گر بستان

معاویہ نے کہا تھا کہ علی بن ابی طالبؑ کے بعد زمانہ بانجھ ہو گیا ہے۔ وہ  
اب ایسا بطلِ جلیل پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح امام حسینؑ جیسا فرزند پیدا کرنا  
بھی ناممکن ہے کیونکہ اگر ویسے ہی والدین ہوں اور ویسا ہی بیٹِ عصمت و طہارت  
ہو تو امام حسینؑ جیسا فرزند وجود میں آئے۔ جلد یا بدیر ہر نقصان کی تلافی ہو جاتی  
ہے مگر ان شخصیتوں کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے جن کو وجود میں لانے والے  
سازگار حالات کے اب پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

### مدینہ واپسی پر امام کا خطبہ

آخر میں اس خطبے کا نقل کرنا بھی ضروری ہے جو امام سجادؑ نے مدینہ  
کے باہر دیا تھا اور جس میں اس مقدس سفر کی روداد اہل مدینہ سے  
بیان کی تھی۔

امامؑ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد روح فرسا مصائب پر خدا کا شکر  
ادا کرتے ہوئے ان چند مختصر جملوں میں واقعاتِ عاشورا کا خلاصہ بیان کیا۔  
”ہر حال میں خدا کا شکر ہے۔ اس نے ہمیں بڑی مصیبتوں میں مبتلا  
کیا۔ اسلام میں بڑا رخنہ پڑ گیا ہے۔ میرے والد ابو عبد اللہ اور  
ان کے عزیز اور ساتھی قتل ہو گئے۔ ان کی خواتین اور فرزندوں  
کو قیدی بنا لیا گیا۔ میرے والد کے سر کو نیزے پر شہر بہ شہر گھمایا  
گیا۔ یہ ایسا سانحہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔“

کرتے وقت یزید نے امام سجادؑ کو بلایا اور ان سے کہا کہ ابنِ مرجانہ پر خدا کی مار  
 اگر آپ کے والد سے میری ملاقات ہو جاتی تو وہ جو کچھ تجویز پیش کرتے ہیں قبول  
 کر لیتا اور حتی الامکان انھیں قتل نہ ہونے دیتا مگر مقدر میں یہی تھا کہ ایسے ہو۔  
 میری خواہش ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت ہو آپ مدینہ سے مجھے لکھیں۔ یزید  
 نے یہ بات کچھ نیکی کی نیت سے نہیں کہی تھی۔ وہ ابنِ زیاد کا مٹون تھا کہ اس  
 نے امامؑ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور اس نے خود ابنِ زیاد کے خط کے  
 جواب میں اسیرانِ اہلبیتؑ کے متعلق لکھا تھا کہ انھیں شام بھیج دو۔ یزید کی  
 ابنِ زیاد پر لعنت صرف سیاسی مصلحت اور عوامی دباؤ کا نتیجہ تھی۔ امامؑ نے  
 شام کے بازار میں ایک شامی کے جواب میں جو تقریر کی تھی اور جو آیات تلاوت  
 کی تھیں، انھوں نے اپنا کام دکھایا تھا۔ یہاں تک کہ دمشق اور خود خلیفہ کے  
 اپنے گھر میں مجلسِ عزا منعقد ہوئی تھی۔ شامی خواتین بھی فاجعہ کربلا کی نوعیت  
 سے بانجرا ہو چکی تھیں اور شاید محرم ۶۰ھ کے اختتام سے قبل ہی اکثر بلادِ اسلامی  
 میں شہادتِ سید الشہداء کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور لوگوں کو صحیح واقعات کا علم  
 ہو گیا تھا۔ ورنہ خلافت کی گرج چمک ٹھنڈی پڑی تو لوگوں کو ہوش آیا۔ وہ امامؑ  
 کی مدد نہ کرنے پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے اور اپنی ناقابلِ تلافی کوتاہی  
 پر بچھتا رہے تھے۔ شدہ شدہ لوگوں کی چہرہ ہی رائے ہو گئی جس کی بنا پر ہال کوفہ  
 نے شہادتِ امامؑ سے پہلے امامؑ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ فتنے کے  
 بادل چھٹے تو لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تلافی بافادت کے درپے ہوئے۔  
 اگرچہ امام حسینؑ کا ہاتھ سے جاتے رہنا نقصانِ عظیم تھا جس کی آہ و نازاری،  
 پیشینانی اور زدامت سے تلافی ناممکن تھی۔

تو نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی رسوائی کا داغ کبھی نہیں دھل سکتا اور یہ بدنامی کبھی نیک نامی میں نہیں بدل سکتی۔“ وخر زہر آنے یزید کو تاریخ کی قضا کی طرف توجہ دلائی اور اسے بدنامی اور رسوائی سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا، لیکن یزید تو عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس نے حضرت زینبؓ کی گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا نہ وہ یہ اندازہ لگا سکا کہ آگے چل کر تاریخ کیا کہے گی۔ اس موقع پر یزید اس حدیث کا مصداق تھا جو سیوطی نے جامع الصغیر میں رسول خدا سے روایت کی ہے کہ جب اللہ مقدر کا فیصلہ نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی عقل سلب کر لیتا ہے اور جب قضا و قدر کا فیصلہ نافذ ہو چکتا ہے تو ان کی عقل لوٹا دیتا ہے۔ اس وقت وہ بچھتا ہے۔ اگر یزید کی عقل نہ ماری گئی ہوتی تو وہ سمجھتا کہ فرزند رسولؐ اور ان کے عزیزوں کو قتل کر کے وہ مسلمانوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ یہ بات بھی نہیں سمجھ سکتا تھا تو اتنا تو اسے شعور ہونا چاہیے تھا کہ کلمہ کھلا اسلام پر حملہ نہ کرتا، فرزند ان رسولؐ سے انتقام لینے کی بات نہ کرتا، وحی آسمانی اور حضرت محمدؐ کی پیغمبری سے انکار نہ کرتا۔ غرض ثانی زہر آنے اپنے خطبے کے آخر میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا:

”وہ اس خدا کا شکر ہے جس نے جو انان جنت کے سرداروں کا انجمن مغفرت اور رحمت قرار دیا۔ جس نے جنت کو ان کی آرام گاہ بنایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کو زیادہ سے زیادہ اپنے فضل اور رحمتوں سے نوازے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہی خطبے تھے جنہوں نے یزید کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ظاہر داری کے طور پر ہی اسی ابن زیاد سے بیزارگی کا اظہار کرے۔ لکھا ہے کہ اہلبیتؑ کو بدینہ روانہ

اس کا فرزند ہوں جس نے اپنی ردا میں حجرِ اسود کو اٹھایا۔  
 تاریخ کے دوسرے صفحے پر یہ بھی تحریر ہے کہ یزید نے کہا تھا کہ بنی ہاشم نے لوگوں  
 کو اس بہانے بیوقوف بنا کر حکومت کرنی چاہی ورنہ نہ کوئی خیر آئی نہ وحی اتری۔  
 اگر یزید کو خدا اور رسولؐ کی شرم نہیں تھی تو کیا وہ تاریخ کی طاقت سے بھی نہیں  
 ڈرتا تھا؟ کیا اسے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے تاریخ میں لکھ لیا جائیگا۔  
 لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، قومیں بدلتی رہتی ہیں لیکن قوموں کے عروج  
 زوال اور حکومتوں کے بدلنے کا تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تاریخ اپنی جگہ باقی  
 رہتی ہے، افراد اور قوموں کے اچھے برے اعمال کی نگرانی کرتی ہے اور ایک کا قصو  
 دوسرے کے سر نہیں منڈھتی۔

قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

”یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا ان کے کام آئے گا اور  
 تمہارا کیا ہوا تمہارے کام آئے گا اور تم سے ان کے کیسے ہوئے  
 کی پوچھ گچھ بھی نہیں ہوگی۔“ (سورۃ بقرہ۔ آیت ۱۴۱)

دختر امیر المومنین حضرت زینبؑ نے اپنی اس تقریر میں جس کا ایک حصہ  
 ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں پھلے تو یزید کو عذابِ آخرت سے ڈرایا اور  
 پھر دنیا اور تاریخ کے حساب کی طرف توجہ دلائی۔

وہ یہ کہنا چاہتی تھیں کہ اگر تو خدا سے نہیں ڈرتا اور یومِ حساب پر تیرا ایمان  
 نہیں باگنا ہوں گے نتیجے میں تیرا ایمان جاتا رہا تو تاریخ کے حساب سے تو ڈر۔  
 حضرت زینب کبریٰؑ کے پیش نظر یہی مطلب تھا جب انھوں نے کہا: ”یزید تو  
 اپنی چالاکیاں کیے جا۔ تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہو کو شمش کو دیکھ۔ خدا کی قسم،

## مسجدِ شام میں دیے گئے خطبے کی تفصیل

آپ نے وہ خطبہ دیکھا جو امام سجادؑ نے دار الحکومت میں دیا تھا۔ اس کے لفظ لفظ سے امامؑ کی صاف کوئی، دلیری اور بلند حوصلگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تقریریں اور خطبات کسی جذباتی دباؤ یا ذہنی پریشانی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ اپنے سفر شہادت و اسیری میں اہمیت نے موقع اور ضرورت کے لحاظ سے عین اس نقشے کے مطابق دیے تھے جو پہلے سے ان کے ذہن میں تھا۔ جس طرح امام حسینؑ بخوبی جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور وہ کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اسی طرح دیگر اہمیت کو بھی مکمل بصیرت حاصل تھی۔ جہاں بولنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے بولتے تھے۔ اپنے تمام رنج و غم، افسردگی و پریشانی کو بھلا کر اس طرح حقائق کو بے نقاب کرتے تھے کہ پھر کسی پھوپھل کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ ہاں بیانات یقینی ہے کہ اس وقت کے بیشتر لوگ ان تقریروں کی اہمیت اور ان کے مقصد کی گہرائی سے واقف نہیں تھے۔ بہت سے لوگ امام سجادؑ کے متعلق بھی یہی خیال کرتے تھے کہ غم کی شدت سے جذباتی ہو رہے ہیں، تقریریں اور وادیاں کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ سکون ہو جائے گا اور سب بھول بھال جائیں گے لیکن تاریخ نے نہ صرف امامؑ کا خطبہ محفوظ رکھا بلکہ بڑی بڑی گفتگو اور اس کے اشعار بھی پہلو محفوظ کر لیے۔ امام سجادؑ نے دمشق میں بڑے فخر سے کہا تھا:

”میں فرزندِ مکہ و منیٰ ہوں، میں فرزندِ مرم و صفا ہوں، میں

کے سبطین یعنی حسنؑ اور حسینؑ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے ہمدنی یعنی امام  
 آخر الزماں ہم میں سے ہیں۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو زید کو چاہیے کہ اگر ہو سکے  
 تو پہلے یہ اعزازات ہم سے چھین کر اپنے نام درج کرے۔ بالفاظِ دیگر  
 اگر ہو سکے تو تاریخ کو بدل دے تاکہ ہمارے اعزازات اُسے مل جائیں اور اس  
 کی بدنامی اور بے دینی فراموش ہو جائے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو زید ہم سے اُسے  
 ورنہ جب تک یہ اعزازات ہمیں حاصل ہیں اور نامورانِ بنی ہاشم جیسے بوطاہرت  
 ان کے بھائی حمزہؓ، ان کے بیٹے علیؑ اور جعفرؓ، فرزندِ ان امیر المؤمنینؑ حسنؑ  
 اور حسینؑ کو اسلام کے سچے خدمت گزاروں کی حیثیت حاصل ہے۔ کوئی نہیں  
 کیسے بدنام کر سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر خود رسول اللہؐ بھی ہیں۔ ہمارا حق کسی  
 اور کو کیسے مل سکتا ہے۔ لوگوں کے دل جو ہمارے ساتھ ہیں وہ کیسے پھرے جاسکتے ہیں۔  
 آخر تنگ آکر زید نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیدیا۔ امامؑ بھی احرامِ اُماش  
 ہو گئے مگر انھیں ایک اور موقع ملا اور اس سے بھی انھوں نے خوب فائدہ  
 اٹھایا۔ جب مؤذن نے کہا: "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ"  
 امامؑ نے عمامہ سر سے اتار کر کہا: اے مؤذن تجھے انہی پیغمبر کی قسم جن کا تو نام  
 لے رہا ہے۔ ذرا خاموش رہ۔ پھر زید کی طرف دیکھ کر کہا یہ رسولِ کریمؐ تیرے  
 جد ہیں یا میرے۔ اگر تو کہتا ہے کہ تیرے جد ہیں تو سب کو معلوم ہے کہ تو جھوٹ  
 بولتا ہے۔ اگر تو مانتا ہے کہ یہ میرے جد ہیں تو تو نے میرے باپ کو کیوں قتل  
 کیا؟ ان کا مال کیوں لوٹا؟ ان کی خواتین کو قیدی کیوں بنایا؟ پھر یا تمہڑے ہاکر  
 امامؑ نے اپنا گرجبان چاک کر لیا اور سلسلہ گفتگو جاری رکھا یہاں تک کہ  
 افراتفری اور شور و غوغا میں مجلس ختم ہوئی اور لوگ منتشر ہو گئے۔

دولت، طاقت اور دوسرے مادی امتیازات پر تھا۔ روحانی عظمت، مکالمہ اخلاق اور دوسرے فضائل انسانی کی ان کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ حجاز کیا ساری دنیا کا سب سے بڑا آدمی محمدؐ ہے، ولید بن مغیرہ نہیں۔

امام سجادؑ نے اپنے خطبے میں ان اسباب پر روشنی ڈالی جن کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر اور ایک قوم کو دوسری قوم پر برتری اور فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آلِ محمدؐ دوسروں سے برتر ہیں اور کوئی ان سے برتری نہیں چھین سکتا نہ کوئی ان کی برابری کر سکتا ہے، کیونکہ یہ برتری انہیں خدا نے دی ہے۔ اسی نے انہیں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کے لیے چنا ہے۔ امام سجادؑ نے کمالِ جرات سے صاف صاف کہا:

”لوگو! ہمیں چھ خوبیاں عطا ہوئی ہیں اور سات خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیں دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ ہمیں جو خوبیاں عطا ہوئی ہیں وہ یہ ہیں: علم، بردباری، فیاضی، فصاحت، شجاعت اور مومنوں میں مقبولیت۔

یعنی مومنوں کے دلوں میں ہماری محبت ہے جو خدا نے ان کے دلوں میں ڈالی ہے، بہ زور و زبردستی سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ زبردستی کسی کو عقیدہ مند نہیں بنایا جاسکتا۔ آپ بزد کو بتلانا چاہتے تھے کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ با ایمان لوگ ہم سے محبت کریں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کو پسند کریں اور ہمیں دشمن سمجھیں۔

پھر آپ نے فرمایا کہ ہمیں اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ نبیؐ محنتِ محمدؐ ہم میں سے ہیں۔ ان کے وصی علیؑ بن ابی طالب ہم میں سے ہیں۔ شیر خدا اور شیر رسول حمزہؑ بن عبد المطلب ہم میں سے ہیں جو غر طیار ہم میں سے ہیں اس امت



شخص جسے بغیر بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے؟ (سورۃ یونس - آیت ۳۵)  
 اس آیت میں کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ مقصود صرف لوگوں کو  
 اس عقلی قاعدے کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قوم کا رہبر وہ ہونا چاہیے جو دوسروں  
 کے مقابلے میں راہِ راست سے زیادہ واقف ہو اور جو خود رہبری کا محتاج ہو  
 وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کریگا۔ ع

آنکہ خود کم است کرا رہبری کند  
 مشرکین مکہ ہر چند کہ رسولِ اسلام کو پیغمبر نہیں مانتے تھے مگر وہ اس عقلی  
 قاعدے کے منکر نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر آنا ہی  
 ہے تو اس کام کے لیے قوم کے کسی بڑے کا انتخاب ہونا چاہیے البتہ بڑائی  
 سے کیا مراد ہے۔ اس معاملے میں وہ غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ  
 بڑا وہ ہے جس کے پاس بہت مال و دولت ہو یا بہت سے بیٹے اور بھائی بند  
 ہوں یا طاقت ہو جس سے وہ اپنی بڑائی اور برتری کا سکہ دوسروں پر بٹھاسکے  
 وہ کہتے تھے کہ اگر خدا ہم اہل حجاز کے لیے کوئی پیغمبر بھیجنا چاہتا تھا تو پھر مکہ  
 کے سربراہ وہ شخص یعنی ولید بن مغیرہ مخزومی یا طائف کے سردار خزومہ بن  
 مسعود ثقفی کو کیوں نہیں بھیجا۔

”انھوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دو لہستہوں کے بڑے آدمی پر

کیوں نہیں اترتا“ (سورۃ زخرف - آیت ۳۱)

مشرکین مکہ یہ تو صحیح کہتے تھے کہ آسمانی کتاب حجاز کے کسی بڑے آدمی  
 پر نازل ہونی چاہیے تھی۔ یہاں تک تو سچ تھا لیکن غلطی یہ تھی کہ وہ ولید یا  
 خزومہ کو بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک بڑائی اور برتری کا دار و مدار

سے منبر نہیں بن جاتا۔ بلکہ ٹریاں تو یہاں اس لیے رکھی گئی ہیں کہ منبر کا جو مقصد ہے اسی کو ختم کر دیا جائے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو خطیب کا روپ دھار کر کسی منبر نما چیز پر چڑھ کر خطاب کرتا ہے مبلغِ دین نہیں کہلا سکتا۔ یہ خطیب جو دنیا کی خاطر دین کو بیچ رہا ہے اور مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدا کے غضب کو دعوت دے رہا ہے، دوزخی ہے۔ امام علیؑ جیسی سستی کی بدگوئی سے خدا ہرگز خوش نہیں ہو سکتا، نہ تیزید کی حمد و ثنا سے خدا کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ ایسی باتیں کہوں جو سامعین کے لیے موجبِ اجر اور ثواب ہوں یعنی جو باتیں خطیب کر رہا ہے وہ راہِ راست سے بھٹکانے والی ہیں اس لیے ان کا نتیجہ سوائے گناہ اور بدبختی کے کچھ نہیں۔ غرض لوگوں نے ایامِ کونفریہ کی اجازت دینے کے لیے تیزید سے اصرار کیا مگر وہ برابر انکار کرتا رہا اور آخر کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ علم و دانش ان کی گھٹی میں بڑا ہے۔ اگر میں نے اسے موقع دیا تو یہ مجھے ذلیل کر دیگا لیکن آخر لوگوں کے اصرار نے اپنا کام کیا اور امامِ سجدہؑ نے منبر پر قدم رکھا اور پھر اس طرح گفتگو کی کہ لوگوں کی چیمیں نکل گئیں اور آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔ اھلِ حق نے اسلامی نظام اور اہلبیتؑ کے مرتبہ پر روشنی ڈالی اور ان کے فضائل و مناقب سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک عقلی قاعدے سے بھی استفادہ کیا جس پر سب عقلاً کا اتفاق ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص رہبری اور پیشوائی کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں سے برتر و ممتاز ہو اور اس امتیاز کی بنا پر ہی رہبر چننا جائے۔ اسی قاعدے کی بنیاد پر قرآن کہتا ہے:

”جو شخص حق کا راستہ بتلاتا ہو آیا وہ اتباع کے لائق ہے یا وہ“

لمحوظ خاطر رکھیں۔ خدا کا پیغام بے کم و کاست مخلوق خدا تک پہنچائیں مخلوق کی خوشامد میں کوئی ایسی بات زبان پر نہ لائیں جو خدا کی ناراضگی کا باعث ہو اور اس فرمان خداوندی پر پورا یقین رکھیں:

”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ نامہ اعمال لکھنے والے دو فرشتے اس کے دائیں بائیں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نکالتے بھی نہیں پاتا کہ نگران فرشتہ تیار رہتا ہے۔“ (سورۃ ق۔ آیت ۱۶ تا ۱۸)

یہ خدا کا فرمان ہے۔ امام سجادؑ بھی خدا کی جانب سے اس طرف توجہ دلا رہے تھے کہ انسان کا ہر اچھا برا عمل لکھا جاتا ہے۔ کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے خدا کے غضب کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور اس دن کو نہیں بھولنا چاہیے جب شخص جسے آج تم بہت طاقتور سمجھ رہے ہو کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

امام سجادؑ نے خطیب کو ملامت کرنے اور اس کی بیجا گفتگو پر اسے سزائش کرنے کے بعد مزید کی طرف رخ کیا اور کہا: مجھے اجازت ہے کہ میں بھی ان لکڑیوں پر کھڑا ہو کر کچھ کہوں جس سے خدا بھی خوش ہو اور سامعین کے لیے بھی اجر و ثواب کا باعث ہو۔

فارئین! امامؑ کے اس مختصر جملے میں بہت ہی لطیف طنز و پہنچا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ امامؑ کو جو کچھ کہنا تھا اس کا خلاصہ اسی مختصر جملے میں آگیا۔ اول تو انھوں نے منبر نہیں لکڑیاں کہا۔ مقصد یہ تھا کہ محض منبر کی شکل لینے

کے چالیس سالہ پردہ پیگنڈے کا موڑ اور کافی جواب نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے ضروری تھا کہ خود اہلبیتؑ اس شہر کے لوگوں سے ملیں اور ان کی غلط فہمیاں دور کریں۔ بنی ہاشم کے ممتاز افراد نے اسلام اور مسلمانان عالم کی جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں ان کا زندہ ثبوت پیش کریں اور بنی امیہ کی رسولؐ خدا اور مسلمانوں سے شرمناک دشمنی کا پردہ چاک کریں۔ یہی وجہ ہے کہ امام سجادؑ نے ہنرد مجلس کے راستہ ہونے کو عنینت سمجھا۔ اگرچہ وہ مجلس آپ کے والد امام حسینؑ اور دادا امیر المومنینؑ کی بدگوئی کے لیے معتقد کی گئی تھی لیکن آپ اس میں شریک ہوئے۔ پھر خطیب منبر پر آیا اور حمد و ثنا کے بعد امام علیؑ اور امام حسینؑ کے خلاف خوب زبان درازی کی اور معاویہ اور یزید کی تعریف میں کچھ اس کی حد کر دی اور ہر اچھی بات کو ان سے منسوب کیا۔ گویا یہی دونوں باپ بیٹے فضائل و کمالات کا سرچشمہ تھے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ تھا وہ آل ابوسفیان ہی کا عطیہ تھا۔ دین و دنیا کی بھلائی انہی لوگوں پر موقوف تھی اور خدائے متعال کی رضا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ انہی لوگوں کا اتباع تھا۔

یہ موقع تھا کہ امام سجادؑ نے بلا خوف و خطر بہ آواز بلند فرمایا: اوبد سخت خطیب! تو کیوں مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خدا کی ناراضگی مولیٰ ہے۔ تیرا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

پھر چند اس جملے میں امامؑ کا روئے سخن و مشق کے خطیب کی طرف تھا جو یزید کو خوش کرنے کے لیے خدا کو ناراض کر رہا تھا اور دوزخ کا راستہ اختیار کر رہا تھا لیکن اس میں ہر نفسہ کے لیے نصیحت ہے اور سب مسلمان مقررین کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں صرف خدا کی رضا مندی کو

سچ تو یہ ہے کہ ان تقریروں کی کامیابی کے لیے مناسب فضا بزرگ صحابی ابوذر غفاریؓ کی کوششوں نے پہلے ہی پیدا کر دی تھی۔ اہلبیتؑ کی شام میں آمد سے اور دمشق میں ان کی گفتگو سن کر لوگوں کے دلوں میں اس بے جگری کی یاد تازہ ہو گئی جس سے ابوذرؓ نے معاویہ کی بے راہ روی کا مقابلہ کیا تھا۔

ابوذرؓ بڑے صاف گو، دلیر اور تندین صحابی تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ دربار خلافت اپنی ڈگر سے ہٹ گیا ہے تو انھوں نے اس کامرانہ وار مقابلہ کیا۔ کتبہ یمینی کی اور خلیفہ کے حاضر و غائب پر کوچہ و بازار میں ہر جگہ تنقید کی۔ غلط نہیں ہو گا کہ اس قسم کی اسلامی تحریکوں کا بانی انھیں سمجھا جائے کیونکہ وہ صحابیؓ رسولیؓ اور تابعیؓ ترتیب کے لحاظ سے دوسروں سے مقدم تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذرؓ شہر بدر کیسے گئے، تکلیفیں اٹھائیں اور آخر مدینہ سے دور کسمپرسی کی حالت میں ریدہ میں وفات پائی لیکن وہ اس حالت میں بھی کبھی خاموش نہیں بیٹھے۔ جب تک ہو سکا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد کچھ اور لوگوں نے ابوذرؓ کے کام کو جاری رکھا۔ ابوذرؓ وفات پا چکے تو حجر بن عدیؓ کنڈیؓ نے ان کی جگہ لے لی اور جو کہنا چاہیے تھا وہ کہا۔ بڑی دلیری اور جرأت سے اس حکومت کا مقابلہ کیا جس نے اسلام کے نام پر امیر المومنینؑ کے خلاف دشنام طرازی کو مذہبی فریضہ قرار دیدیا تھا بلکہ عبادت کی مقبولیت کی شرط ٹھہرایا تھا۔ اسی جہد و جہد میں انھوں نے جان دیدی۔ حجرؓ، دمشق نہیں پہنچ سکے۔ دمشق کے نزدیک مرج عذراء کے مقام پر ہی انھیں قتل کر دیا گیا لیکن وہ وہیں اپنی بات کہتے اور امام علیؑ کا دفاع کرتے رہے مگر ابوذرؓ ہوں یا حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی، ان کی کوششیں اموی حکومت

اہلبیتؑ سے بغض و عداوت کا مرکز رہا۔ ۳۱ھ میں کسی نہ کسی بہانے امام سجادؑ  
 وہاں پہنچے تو انہیں موقع ملا کہ براہ راست لوگوں سے بات کر کے ان حقائق پر  
 سے پردہ اٹھائیں جو کچھ چھبیس سال سے اہل دمشق کی نظروں سے اوجھل  
 تھے۔ تقریر کرنے کا یہ موقع امامؑ کو یونہی نہیں مل گیا تھا بلکہ بڑی تکالیف اٹھانے  
 کے بعد ہاتھ آیا تھا لیکن بڑا غنیمت تھا۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا کہ خود خلیفہ  
 کے اصرار پر امیر المؤمنینؑ اور امام حسینؑ کے فرزند دمشق آئیں اور اس منبر سے جو ان  
 کے آباء کرام کی بدگونی کے لیے وقف تھا، بنی امیہ کے چھبیس سالہ مسموم  
 پروپیگنڈے کا زور توڑیں اور ایک ہی تقریر میں ان لوگوں کا رنگ بدل دیں  
 جو سالیسا سال سے گمراہی میں مبتلا تھے۔ اہل شام نے تو اس سے قبل ان مقدس  
 بزرگوں کے نام بھی کم ہی سنے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس وقت تک بیشتر اہل شام کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ  
 اسلام میں سید الشہداءؑ و محمدؐ بن عبدالمطلب کا لقب ہے یا یہ کہ رسول خداؐ نے  
 فرمایا ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ جو انان جنت کے سردار ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تصور  
 بھی نہیں کیا جاسکتا کہ امام سجادؑ اور ان کی چھوٹی زینبؑ کو موقع بلیسر آتا یا  
 یہ موقع جو انہیں ملا تھا وہ اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تو خلافت بنی امیہ کے  
 خاتمے یعنی ۳۲ھ تک کوئی دمشق کے ناسازگار ماحول میں بزرگانِ اہلبیتؑ  
 کی عظمت کی بات بھی کر سکتا یا اسلام کی قابل قدر شخصیتوں کی حیثیت سے ان  
 کا تذکرہ کر سکتا لیکن ان تقریروں کے بعد یہ صورت ہوئی کہ بنی امیہ کی ہزار ہا ہانہ  
 حکومت جس میں امیر المؤمنینؑ کے دوستوں نے بڑے دکھ اٹھائے تھے اور بیٹیں  
 جھیلی تھیں وہ تو ختم ہو گئیں لیکن ان کی تقریروں کا اثر اسی طرح قائم و دائم رہا۔

کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کھیلایا گیا تھا مگر اس ڈرامے کو کھیلنے والے یہ نہ سمجھ سکے کہ جو صورت بھی پیش آئے اہل حق اس سے کچھ فائدہ ہی اٹھاتے ہیں اور ان کی تنہا ہی کے لیے جو نقشہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کے فضل و کرم سے ان کے استحکام ہی کا سبب بنتا ہے۔ اس شہر میں امام سجادؑ کی تقریر کی خاص طور پر بہت ضرورت تھی کیونکہ شہر دمشق جب سے مسلمانوں نے فتح کیا اس وقت سے لیکر اسیران اہلبیتؑ کے وہاں پہنچنے تک یعنی چھبیس سال سے مسلسل بنی امیہ کے زیر اثر چھلا آ رہا تھا اور وہاں کی اسلامی حکومت پر ہمیشہ اہلبیتؑ کے دیرینہ دشمنوں یعنی امویوں کا تسلط رہا تھا۔

۳۱ھ میں حضرت ابو بکرؓ کی وفات سے چار روز قبل مسلمان مجاہدین نے خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں دمشق کا محاصرہ شروع کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد خالد بن ولیدؓ کو برف کھڑا کر دیا۔ خالدؓ کی جگہ ابو عبیدہؓ نے لے لی۔ ایک سال اور کچھ دن دمشق کا محاصرہ جاری رہا۔ رجب ۴۲ھ میں مسلمان دمشق کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دمشق کی امارت کچھ مدت یزید بن ابی سفیان کے پاس رہی۔ ۴۵ھ میں یزید کے طاغون عمرو اس میں فوت ہوئے پر حضرت عمرؓ نے یزید کے بھائی معاویہؓ کو دمشق کا امیر مقرر کر دیا۔ ۴۷ھ سے ۵۷ھ یعنی امیر المومنینؑ کی حکومت کے آغاز تک شام کی حکومت بدستور معاویہ ہی کے ہاتھ میں رہی۔ امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کی بیچ سالہ حکومت کے دوران میں بھی یہی صورت رہی اور دمشق اہلبیتؑ سے دشمنی کا مرکز بنا رہا۔ ۵۸ھ میں امام حسنؑ کے دستبردار ہونے پر دمشق اسلامی حکومت کا دار الخلافہ بن گیا اور اگلے بیس سال یعنی ۶۸ھ تک پہلے سے بڑھ کر بنی ہاشم خصوصاً

یعقوبی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے رسولِ خدا سے درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے ساتھ مدینہ چلیں اور عہد کیا تھا کہ اپنے اور بیگانے، گورے اور کلمے ہر ایک کے مقابلے میں آپ کا ساتھ دینگے۔ عباس بن عبدالمطلب نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے ان سے معاہدہ کر لینے دیجیے۔ آنحضرتؐ نے اپنے چچا کو اجازت دیدی۔ عباس نے ان سے عہد لیا کہ رسولِ خدا اور ان کے ساتھیوں کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے اور پرانے، گورے اور کلمے ہر ایک کے مقابلے میں ان کا ساتھ دینگے۔ رسولِ خدا نے بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے تو انکی جگہ جنت ہوگی۔

### تاریخ عاشورا کی سہ

تاریخ عاشورا کے سلسلے میں ایک قیمتی حوالہ جو سند کا کام دیتا ہے وہ خطبہ ہے جو امام سجادؑ نے دمشق میں ۱۱۰ھ میں دیا تھا۔ غالباً یہ خطبہ خاص دمشق کی جامع مسجد میں دیا گیا تھا۔ امام سجادؑ کو ایک مناسب موقع ملا تھا جس سے انھوں نے بہترین طریقے سے فائدہ اٹھایا۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امامؑ کو بہترین موقع اس دن ملا جب خلیفہ وقت کے سرکاری خطیب نے منبر پر امام علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے فرزندوں کی بدگونی کی اور معاویہ اور فرزدان معاویہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کیے۔ یہ ڈرامہ خود بیزید نے کھیلا تھا۔ اسی نے حکم دیا تھا کہ خطیب منبر پر آکر اہل شام کو امام حسینؑ اور ان کے پدر گرامی کے معائب سے آگاہ کرے۔ (العیاذ باللہ) یہ ڈرامہ بھی بہت سے ایسے ڈراموں کی طرح اہل حق اور تحریکِ حق



اگلے سال یعنی ۳ سالہ سال بعثت میں اہل مدینہ میں سے بارہ اشخاص نے  
 عقبہ کے پاس منیٰ میں رسولِ خدا سے بیعت کی۔ ان میں سے پانچ تو وہی پچھلے سال  
 والے تھے اور سات دوسرے تھے۔ ان سب سے رسول اللہ نے اس بات پر بیعت  
 لی کہ کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے، پوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے،  
 اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، حرام کے بچے پیدا نہیں کریں گے، حرام کاموں میں  
 رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ رسول خدا نے بھی ان سے وعدہ کیا کہ اگر تم  
 اپنی بات پر قائم رہے تو تمہیں جنت ملیگی۔ اگر تم نے ان میں سے کوئی گناہ کیا  
 اور تم پر حد جاری ہو گئی تو وہ حد اس گناہ کا کفارہ ہو جائے گی۔ اگر جرم چھپا  
 رہا تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو  
 معاف کر دے۔ یہ بارہ اشخاص یشرب جانے لگے تو آنحضرت نے مصعب بن عمیر  
 عبد رمان کو ان کے ساتھ کر دیا تاکہ اسلام کی تبلیغ کریں اور جو کوئی مسلمان ہو جائے  
 اسے قرآن پڑھائیں مصعب کی تبلیغ سے مدینہ میں اس طرح اسلام پھیل گیا کہ  
 اوس و خزرج کا کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں کچھ مسلمان مرد اور عورتیں نہ ہوں۔  
 ۳ سالہ بعثت میں پچھتر مسلمان مرد اور عورتیں منیٰ میں عقبہ کے نزدیک رسول خدا  
 کے پاس جمع ہو گئے اور رسول خدا کے چچا عباس کی موجودگی میں آنحضرت سے  
 بیعت کی۔ یہ بیعت آدھی رات کو مناسک حج ختم ہونے کے بعد انجام پائی۔ اس  
 وقت تک عباس مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن انھیں اپنے بھتیجے کی سلامتی  
 سے دلچسپی تھی اس لیے وہ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اہل مدینہ سے عہد لیا  
 کہ وہ اپنی بات پر قائم رہیں گے اور یہ وفائی نہیں کریں گے۔ عباس نے کہا کہ اگر انھیں  
 ذرا بھی اندیشہ ہو کہ وعدہ پورا نہیں کر سکو گے تو رسول خدا کو بلا و جہ انکے گھر سے مت لیجاؤ۔

میں تم سے بات کروں۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی اور قرآن حکیم کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں۔ اہل یثرب رسول اللہ کی گفتگو سن کر آپس میں کہنے لگے: بخدا یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے یہودی ہیں ڈراتے ہیں۔ یہ چھ آدمی تھے جن کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ انہوں نے رسول اللہ کی دعوت قبول کر لی اور وہیں اسلام لے آئے۔ پھر کہنے لگے کہ ہماری قوم میں آپس میں ناچاقی اور دشمنی ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی برکت سے آپس میں ہماری صلح صفائی ہو جائے۔ اب ہم یثرب واپس جاتے ہیں وہاں ہم لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے، ہو سکتا ہے کہ خدا انہیں ہدایت دیدے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم باعزت اور طاقتور ہو جائیں گے۔ ادھر تو اوس و خزرج کے قحطانی قبیلے اسلام قبول کر رہے تھے اور اپنے شہر میں رسول اللہ کی ہجرت کا سامان کر رہے تھے، ادھر آپ کے اپنے قبیلے قریش کے لوگ آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان کی فلاح و بہبود رسول اللہ کے قتل پر ہی منحصر تھی۔ سچ ہے جس کا اپنے ساتھ نہیں دیتے، اللہ اس کی مدد کے لیے عیڑوں کو آمادہ کر دیتا ہے۔

یہ چھ خزرجی مدینہ واپس آئے۔ رسول اللہ سے ملاقات اور بات چیت کا حال ایک اہم خبر کے طور پر لوگوں کو سنایا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ اسلام کے فوائد بیان کیے اور متوقع عزت، طاقت اور خوشحالی سے آگاہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یثرب میں اسلام پھیلنے لگا اور اوس و خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں رسول اللہ خدا کا چرچانہ ہو۔ سب سے پہلے اسلام لانے والے انصاریوں کی تعداد بعض نے دو اور بعض نے اٹھ لکھی ہے۔

اپنی طاقت میں اضافہ کریں مگر قریش نے ایسی شرائط پیش کیں جو ان کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ اس کے بعد وہ طائف گئے اور قبیلہ ثقیف سے مدد کی درخواست کی۔ انھوں نے بھی ٹال مٹول کی اور وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس آئے۔ اسی اثنا میں رسول اللہ نے ستر سال بعثت سے علانیہ اپنی دعوت کا آغاز کر دیا تھا۔ دس سال تک متواتر آپ عرب کے میلوں مثلاً عکاظ اور ذوالحجاز میں اور حج کے موقع پر متیٰ اور مکہ وغیرہ میں لوگوں سے رابطہ قائم کرتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ رسول خدا ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے اور کہتے کہ لا الہ الا اللہ کہو تاکہ تم قلاح پاؤ۔ ایمان لاؤ گے تو دنیا میں عرب و عجم پر تمھاری حکومت ہوگی اور مرنے کے بعد جنت ملے گی مگر بجز شرب کے ان دو قبیلوں یعنی اوس اور خزرج کے کسی کو آپ کی دعوت قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور بجز یثرب کے کوئی شہر بے غامناں مسلمانوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ صرف یہی ایک شہر تھا جس نے ہمیشہ کے لیے رسول خدا کے جسم اطہر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ستر سال بعثت میں حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد رسول خدا کا مکہ میں رہنا دشوار ہو گیا۔ طائف کے شہر نے بھی رسول اللہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں آپ نے قبائل سے رابطہ کرنے کی اور زیادہ کوشش کی۔ اہل یثرب سے آپ کی دو مختصر ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ بعثت کے گیارہویں سال موسم حج میں متیٰ کے مقام پر آپ نے اہل یثرب کی ایک جماعت سے طاقات کی اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم قبیلہ خزرج کے آدمی ہیں۔ آپ نے کہا کہ کیا یہودیوں سے تمھارا معاہدہ ہے؟ انھوں نے اقرار کیا۔ آپ نے کہا کہ ذرا بیٹھو تو

قبیلے رسول اللہ کی نصرت اور پذیرائی پر آمادہ ہو گئے اور توقع سے بڑھ کر پیغمبر اسلام کے لیے جان نثاری کا ثبوت دیا۔ یہ عدنانی یا اسمعیلی نہیں تھے قبیلہ قریش اور خاندان بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں تھا لیکن خدانے انہی غیروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ پیغمبر اسلام کے لیے جو کہ میں تنگ آچکے تھے اور جن کا اپنے گھر میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا اپنی آغوش وا کر دیں، انھیں اور ان کے اصحاب کو اپنے گھروں میں جگہ دیں اور انھیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز سمجھیں۔ اس کے لیے اسباب پیغمبر اسلام کی ولادت سے سینکڑوں سال قبل ہی سے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

### اوس اور خزرج

سدّ مارب کی تباہی کے بعد یمن کی بہت سی اراضی ناقابل کاشت ہو گئی تھی اور بحیرہ احمر کا سمندری راستہ کھل جانے کے باعث یمن کی اقتصادی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ ان دو اسباب کی بنا پر کئی یمنی قبائل جنوبی عرب سے ہجرت کر کے شمالی عرب میں وادی القرئی اور یثرب کے علاقوں میں آ بیسے۔ ان دو قبیلوں کو بھی اللہ نے کسی نہ کسی بہانے یثرب میں پہنچا دیا جہاں وہ مستقل طور پر آباد ہو گئے۔

جس دن سے یہ قبیلے مدینہ میں آ کر آباد ہوئے تھے ان کے درمیان جنگ برپا نہ تھی تھی۔ آخر یہ تنگ آ گئے اور انھیں خوف ہوا کہ اس طرح تو تباہ و برباد ہو جائیں گے اور یثرب کے یہودی قبائل بنی نضیر اور بنی قریظہ وغیرہ ان پر غالب آجائیں گے۔ ناچار ان میں سے کچھ لوگ مکہ گئے تاکہ قریش سے مدد حاصل کر کے

کو اذیتیں دیں، بعض کو ہولناک طریقوں سے مار ڈالا۔ رسول اللہ کے متعلق بدزبانی اور باوہ کوئی کی یہاں تک کہ آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آپ کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور لڑائی پھیر ڈی۔ فتنے برپا کیے، آپ کے ساتھیوں کو قتل کیا، آپ کے خلاف یہودیوں کو اکسایا۔ انھیں عہد شکنی پر آمادہ کیا، بدوی قبائل میں اپنے شعراء بھیج کر انھیں ورغلا یا یہاں تک کہ شہر میں مشرکین مکہ نے بدویوں اور یہودیوں کا بارہ ہزار کا لشکر مسلمانوں پر حملے کے لیے اکٹھا کر لیا۔ یہ سب کام رسول اللہ کے اپنے قریشی اعزہ و اقرباء نے انجام دیا۔ وہی ناشکرے یہ سب کچھ کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی اپنی دشمنی سے باز نہیں آئے اور فتح مکہ تک جب ان میں بالکل دم نہیں رہا معاندانہ کارروائیاں کرتے ہی رہے۔ امیر المومنین امام علیؑ معاویہ کو لکھتے ہیں:

”ہماری قوم قریش نے ہمارے نبی کو قتل کرنے اور ہمارا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی۔ ہماری زندگی اچیرن کر دی۔ ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟ ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا۔ ہمیں ایک ناہموار پہاڑی میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور ہمارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائی۔“ (سنج البلاغہ - ج ۹) پہاڑی میں پناہ لینے پر مجبور کیا یعنی مکہ کی ایک گھاٹی، شعب ابیطالب میں تین سال اور چند مہینے تک محصور و محبوس رکھا۔

یہ تھا رسول اللہ کے اپنے عزیزوں کا سلوک اور یہ تو نہ ہے انکی دشمنی اور بیوقوفانی کا اس شخص کے ساتھ جس کی سر بلندی اور نام آوری سب سے زیادہ انہی کی عزت و افتخار کا سبب تھی۔ ان سنگدل اور بیوفات قریشیوں کے مفاد میں جو گویا خود اپنی عزت و ناموری کے دشمن تھے، دو مینی الاصل مخطانی

بھائی امام حسنؑ کی خلافت کے دور میں عراق میں رہے تھے، ورنہ پوری زندگی مدینہ ہی میں گزار ہی تھی۔ مدینہ وہ شہر تھا جہاں رسول اللہؐ کو تبلیغ کے لیے سازگار ماحول ملا تھا۔ مکہ تو اس وقت قید خانہ بن چکا تھا۔ مدینہ ہی میں مناسب فضا بیدار آئی تھی۔ اسی شہر سے پیغمبر اسلام کی دعوت ساری دنیا میں پھیلی۔

### قریش کا رسولؐ خدا سے سلوک

مدینہ نے اسلام کے پھیلنے کے لیے جو سہولت ہم پہنچائی تھی، امام علیؑ نے بھی ایک نطلے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

رسولؐ خدا مکہ میں متولد ہوئے، مدینہ کہ ہجرت کی۔ اس شہر سے آپ کا نام بلند ہوا اور آپ کی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچی۔ (بخاری، الطبائع، خطبہ ۱۵۶)

رسولؐ اللہ کے اقربانے تو ان سے دشمنی کی، لڑے اور انھیں گھر سے نکال دیا لیکن اوس اور خزرج نے ان کو قبول کر لیا۔ انھیں اپنے شہر میں لے آئے اور ان کے لیے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ یہی حقیقت امام علیؑ نے اپنے کلماتِ قصار میں بیان کی ہے۔ ایک کلمے میں آپ نے کہا ہے کہ ”جس کا اپنے ساتھ نہیں دیتے اس کی مدد کے لیے خدا غیر اور بیگانے عیا کر دیتا ہے۔“

رسولؐ اللہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ قریش کے بچپن خاندان جو سب رسولؐ اللہ کے رشتے دار تھے اور جن کا سلسلہ نسب رسولؐ اللہ کے اجداد یعنی ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، عدنان اور نضر بن کنانہ تک پہنچتا تھا، یہ سب عدنانی اور قریشی رسولؐ اللہ کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک ان سے ہوسکا انھوں نے اسلام کو پھیلنے سے روکا، رسولؐ اللہ کے پیر و کاروں

سے پرغاش رکھنا تھا۔ عثمان کے قتل اور امام علیؑ کے خلیفہ ہو جانے کے بعد شام چلا گیا۔ جنگ صفین میں معاویہ کے ساتھ تھا۔ کہتے ہیں کہ جنگ صفین میں انصار میں سے صرف دو ہی صحابی معاویہ کے ساتھ تھے۔ ایک یہ نعمان دوسرے سلمہ بن خالد نعمان شہزادہ تک زندہ رہا۔ اسی سال خلافت کا سودا سما یا اور کچھ طرفدار اکٹھے کر لیے لیکن مروان بن حکم کے مقابلے میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ بہر حال کچھ بھی ہو اس سفر میں تو شام سے مدینہ تک اہلبیتؑ کے ساتھ بہت ادب و احترام کا بڑا دکھاوا اور اس حسن سلوک کو ہر مسلمان قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ اہلبیتؑ مدینہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہی مدینہ جو آغاز ہجرت یعنی پچھلے آگسٹھ برس سے رسولؐ اور آل رسولؐ کا مسکن رہا تھا۔ جمال کے باشندوں یعنی انصار نے جو قبائل اوس اور خزرج سے تعلق رکھتے تھے رسولؐ اللہ کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ وہی شہر جس نے اپنے دروازے رسولؐ اللہ کے لیے اس وقت کھول دیے تھے جب اور سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہی شہر جس نے مہاجرین کو جو مکہ اور حجاز کے دوسرے نواحی علاقوں سے بھاگ کر آئے تھے، اپنی آغوش میں جگہ دی تھی۔ رسولؐ خدا کو بھی اس شہر سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ شہر میں فتح مکہ کے بعد بھی آپ نے مکہ میں قیام نہیں فرمایا اور جنگ حنین اور غزوہ طائف کے بعد بھی مدینہ ہی واپس تشریف لے آئے اور باقی عمر وہیں گزاری۔ فقط ساتھ میں مناسک حج ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے اور حج سے فراغت کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔

امام حسینؑ اور ان کے بہن بھائی مدینہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ امام حسینؑ اپنی عمر کے ستاون سال میں سے صرف چار سال اور چند مہینے اپنے والد اور اپنے

## نعمان بن بشیر

نعمان بن بشیر کو حکم ہوا کہ اہلبیت کی واپسی کا انتظام کرو اور ایک دیباہدار اور نیک آدمی ان کے ہمراہ بھیجو۔ شیخ مفید کی روایت کے مطابق خود نعمان بن بشیر کو بھی ساتھ جانے کا حکم ہوا تھا۔ اخبار الدول میں ہے کہ نعمان بن بشیر تیس آدمیوں کے ساتھ اہلبیتؑ کی ہمراہی میں شام سے مدینہ گیا تھا۔ راستے میں اس نے اہلبیتؑ کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس قدر ادب و احترام کا برتاؤ کیا کہ مدینہ پہنچ کر امیرالمؤمنینؑ کی بیٹی فاطمہ نے جو ایسروں میں شامل تھیں اپنی بہن زینبؑ سے کہا کہ یہ شخص ہم سے بہت اچھی طرح پیش آیا ہے اسے کچھ انعام دیدو لیکن نعمان نے انعام قبول نہیں کیا اور کہا کہ اگر میں نے کوئی خدمت کی ہے تو وہ خدا کی خوشنودی اور رسول خدا سے آپ کی قربت کا لحاظ کرتے ہوئے کی ہے۔

یہ نعمان بن بشیر اور اس کے باپ دونوں صحابی تھے۔ اس کے باپ بشیر بن سعد خزرجی پہلے شخص تھے جنہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ابو بکر کی بیعت کی۔ لکھا ہے کہ بیعت میں ان کا مقصد رھنائے الہی نہیں تھا بلکہ اس لیے بیعت کی تھی کہ کہیں سعد بن عبادہ خزرجی کو خلافت نہ مل جائے چونکہ وہ سعد سے حسد رکھتے تھے اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ خود ان کے سوا کوئی دوسرا خزرجی خلیفہ ہو جائے۔ اسی خیال سے ابو بکر کی بیعت میں جلدی کی اور ماجربین سے بھی پہلے بیعت کر لی۔ خود نعمان ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے امام علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اہل کوفہ چونکہ امام علیؑ کے طرفدار تھے اس لیے یہ ان



پھیل گئی۔ جب امام سجادؑ نے دیکھا کہ سارا شہر اُمتڈ آیا ہے تو آپ نے اشارے سے لوگوں کو خاموش کیا۔ اس موقع پر انھوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے کسی ماہ کے سفر کی روداد سے مسلمانانِ مدینہ کو آگاہ کریں۔ اس کا تذکرہ ہم انشاء اللہ آگے چل کر کریں گے۔

جب اہلبیتِ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو وہ ہر چند کہ سوگوار اور غمزدہ تھے لیکن انھیں اپنی کامیابی اور دشمن کی بے بسی کا پختہ یقین اور اطمینان تھا۔ وہ ابھی شام ہی میں تھے کہ یزید کی بے بسی کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارتاً کہا ہے کہ انھیں جلد ہی قید سے رہائی مل گئی تھی اور خلیفہ کے حکم پر انھیں دمشق منتقل کر دیا گیا تھا۔ اہل دمشق ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے۔ جیسا کہ طبری نے لکھا ہے، خاندانِ معاویہ کی عورتیں بلا استثناء ہاشمی خواتین کے پاس تعزیت کے لیے آئیں اور امام حسینؑ کا پرستہ دیا۔ تین دن تک خلیفہ کے محل میں مجلسِ عزابراہی۔ یزید و پورا درشام کا کھانا امام سجادؑ کی موجودگی کے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ ایک دن امام حسنؑ یا امام حسینؑ کا ایک چھوٹا بچہ امام کے ساتھ موجود تھا۔ یزید نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا: تم میرے بیٹے خالد کے ساتھ ٹڑو گے؟ اس نے کہا: ہاں مگر ایک شرط پر۔ ایک چھری مجھے دو اور ایک اسے پھر لڑوں گا۔ اتنے مصائب اٹھانے کے بعد بھی بچے کی دلیری سے یزید بہت متاثر ہوا اور کہا: شیر کا بچہ بھی شیر ہی ہوتا ہے۔

اور کہا: ”اے اہل یشرب! اس شہر میں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو؟ حسین بن علی قتل کر دیے گئے، ان کے غم میں آنسو رواں ہیں۔ امام کا قاصد اتنا ہی کہنے پر اکتفا کر سکتا تھا لیکن اتنی بات کو اس نے اپنے اور اپنے امام کے مقصد کے لیے کافی نہیں سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ روئیں اور نوحہ سرائی کریں۔ ہاں وہ بی ضرور چاہتا تھا کہ واقعہ کربلا کے متعلق ایک سند اور حمیہ ہو جائے تاکہ آئندہ آنے والوں کے لیے تاریخ عاشورا کے مطالعے کی راہ ہموار ہو سکے“ امام حسینؑ کی تحریک صرف مجالس عزائم سے متعلقہ کر کے ثواب کمانے کے لیے نہیں تھی۔ اسے صرف ایک اثر انگیز واقعہ کے طور پر منبروں پر مذہبی تقریروں کا موضوع بنانے اور رونے رلانے کے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ امام حسینؑ کی تحریک کی تاریخ، اسلامی تاریخ کا ایک زندہ و خوشنڈہ باب ہے جس کی اصل روح کا مطالعہ کرنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی قدر و قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ دوسرے موضوعات کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ امام کے فرستادہ نے دوسرے شعر میں اموی خلافت کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا۔ اس نے قبر رسولؐ کے قریب فریاد کرتے ہوئے کہا:

ان بد طبیعت اور کافر سیرت لوگوں نے فرزند رسولؐ کو قتل کر دیا۔ ان کے جسم کو خاک و خون سے آلودہ کیا اور ان کے سر کو نیزہ پر چڑھا دیا۔  
اس کے بعد لوگوں کو اہلبیتؑ کی آمد کی اطلاع دی اور کہا کہ اس وقت وہ شہر سے باہر اترے ہوتے ہیں۔

یہ سنتے ہی لوگوں نے ادھر کا رخ کیا۔ راستے بند ہو گئے۔ افسرانہ فری

دیوانے کی پوری کوشش کی تھی اور محاصرے کے دوران آبِ رسائی کا کام بھی انجام دیا تھا۔ عمرو بن سعید نہیں سمجھتا تھا کہ اس جھوٹ اور بہتان سے اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ اس کی رسوائی میں مزید اضافہ ہو۔ عمرو بن سعید نے مسجدِ نبویؐ میں برسرِ امام کی شہادت کا اعلان کیا لیکن جس طرح دوسرے موقعوں پر اہل بیتؑ دشمن کی یا وہ کوئی کے جواب میں انہما حقیقت کرتے رہے، خاندانِ عصمت و طہارت کی ایک خاتون نے حاکمِ مدینہ کی بدگوئی کا وہ جواب دیا جو تاریخ کے صفحات پر رچ ہو گیا۔ لکھا ہے کہ اس موقع پر عقیل بن ابی طالب کے گھرانے کی ایک لڑکی دیگر ہاشمی خواتین کے ساتھ رسول اللہ کے مرقدِ مطہر پر آئی اور قبر سے پٹ کر دو شعر پڑھے اور ان میں تاریخِ عاشورا کا خلاصہ بیان کر دیا۔ اشعار کا مطلب یہ ہے:

”روزِ قیامت انہی حسینؑ بن علیؑ کے نانا جنہیں قتل کر کے تم خوش ہو رہے ہو تم سے پوچھیں گے کہ تم تو آخری امت تھے، تم نے میرے بعد میری اولاد سے یہ کیا سلوک کیا کہ ان کے مردوں کو تو خون میں ہنلا کر قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔“

### اہل بیت کی مدینہ واپسی

اس طرح اہل مدینہ کو شہادتِ امام سے آگاہی ہوئی۔ اب وہ اس کے منتظر تھے کہ اسیرانِ اہلبیت کب واپس آتے ہیں۔ آخر وہ تاریخِ دن بھی آگیا۔ امام سجادؑ اور ان کے ہمراہی مدینہ کے قریب پہنچ کر سوار یوں سے اترے۔ خواتین کو اتارا، پھر ایک آدمی بھیجا کہ مدینہ جا کر امامؑ کی آمد کی اطلاع کر دے۔ امام کا فرستادہ کہتا ہے کہ میں مسجدِ نبویؐ پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں نے آواز کر کے بلدی

سیاسی منظر سے ہٹا دیے گئے اور آل ابی سفیان کی سربراہی چختہ ہو گئی۔ وہ قریشی یہ مختصر جواب سنتے ہی سمجھ گیا کہ کیا کچھ پیش آیا ہے۔ اس نے کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ معلوم ہوتا ہے حسین بن علیؑ قتل کر دیے گئے۔ عبدالملک کہتا ہے کہ جب میں عمرو بن سعید بن عاص اموی کے پاس پہنچا تو اسے بھی عراق کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ کہو عراق سے کیا خبر لائے؟ میں نے کہا کہ ایسی خبر لایا ہوں کہ امیر سن کر خوش ہو جائیں گے اور وہ خبر یہ ہے کہ حسین بن علیؑ قتل ہو گئے اور جھکڑ ختم ہو گیا۔ عمرو بن سعید اموی یہ خبر سن کر پھولا نہیں سما یا۔ کہنے لگا جاؤ اور لوگوں کو ان کے مارے جانے کی خبر سناؤ۔ میں وہاں سے باہر نکلا اور باواز بلند اعلان کیا کہ حسین بن علیؑ عراق میں شہید ہو گئے۔ بی ہاشم کی خواتین نے یہ سنا کر اس طرح آہ و زاری شروع کی کہ میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عمرو بن سعید نے زمان بنی ہاشم کی آہ و فغاں کی آوازیں سنیں تو ایک قہقہہ لگا یا اور کہا:

”یہ کہہ کر عثمان بن عفان پر کہ یہ کا بدلہ ہے“ یعنی آج ہاشمی خواتین رو رہی ہیں اور میں کر رہی ہوں۔ کل اسی طرح اموی خواتین عثمان پر بہن کر رہی تھیں۔ عمرو بن سعید بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا جس میں بیزید اور ابن زیاد مبتلا تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ تاریخ کو توڑا مڑا جا سکتا ہے، وہ حسین بن علیؑ کے قتل کو عثمان کے قتل سے مربوط کرنا اور بی نظاہر کرنا چاہتا تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالب اور ان کے بیٹے قتل عثمان میں ملوث تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ عثمان کے ابتلاء میں ان کا کردار صرف نصیحت، محبت اور خیر خواہی کا تھا۔ قتل عثمان میں ان کا ذرا بھی ہاتھ نہیں تھا بلکہ انھوں نے تو قتل کو

وہ بیخیال کرتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مومنین کو اپنی چال بازیوں سے بے بس کر دینگے لیکن وہ اپنے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس فریب کاری میں خود ان کا اپنا ہی نقصان ہے۔ جتنا ناپسندیدہ کاموں پر اصرار کرینگے اور پھر ان پر فخر کرینگے، اتنا ہی تاریخ کی عدالت سے راہ گریزان کے لیے مسدود ہو جائے گی۔ ابن زیاد نہیں جانتا تھا کہ تاریخ اسے ایک بدترین شخص کے طور پر یاد رکھے گی اور تاریخ کا فیصلہ اس کے حق میں کیا ہوگا اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا نام تاریخ میں کیسے روشن ہوگا اور ان کی تحریک اور جدوجہد کس طرح تاریخ انسانیت کی درخشاں ترین جدوجہد قرار پائے گی۔

بہ صورت عبد الملک سلمیٰ چونکہ ابن زیاد سے مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا لہذا وہ اس کے حکم سے مدینہ روانہ ہوا اور بجلت تمام حجاز پہنچ گیا۔ اہل مدینہ نے جو دیکھا کہ عراق سے ایک قاصد آیا ہے، سمجھ گئے کہ ضرور عراق کے واقعات کی خبر لایا ہوگا۔ ایک قریشی نے جس کا نام تاریخ میں مذکور نہیں عبد الملک کو دیکھ کر اس سے پوچھا کہ کو عراق سے کیا خبر لائے ہو؟ اس کا مقصد یہی معلوم کرنا تھا کہ حسین بن علیؑ اور اموی دربارِ خلافت کی کشمکش کا کیا نتیجہ نکلا۔ خلیفہ کے خلاف اہل کوفہ کی جدوجہد کہاں تک کامیاب ہوئی اور اب وہاں کس کی حکومت ہے۔ عبد الملک نے جواب میں اتنا کہا کہ صحیح خبر امیر کے پاس ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا ہے میں اس کی اطلاع امیر کو دوں گا۔ خلفہ عدول کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا وہ سمجھ گئے کہ جب حالات کی اطلاع امیر کو دی جا رہی ہے تو بڑید کا مقررہ کردہ ہے اور خود بھی اموی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ

ہی کے اندر مسلمان تھی سے اس قدر دُور جا پڑے تھے کہ آپ کے فرزندوں اور عزیزوں کے قتل کی خبر ایک مژدہ کے طور پر شہر کے حاکم کو بھیجی جاتی ہے، جہاں آپ نے ہجرت کی تھی اور جو آپ کا مدفن ہے۔ عبد الملک بن ابی حارث کو یہ خبر مدینہ لے جانے میں تامل تھا اور امامؑ کے عزیزوں اور متعلقین سے شرم آتی تھی۔ اس نے معذرت کی اور یہ چاہا کہ اسے اس خدمت سے معاف رکھا جائے لیکن ابن زیاد کے ہاتھ میں طاقت تھی اور وہ امامؑ کو قتل کر کے پہلے سے بھی زیادہ تند خو ہو گیا تھا۔ اس نے عبد الملک کو دھکی دی اور کہا کہ تجھے یہ خوش خبری لیکر مدینہ جانا ہی پڑے گا اور تجھ سے پہلے یہ خبر مدینہ نہیں پہنچی چاہیے۔ کچھ دیر ہم دینار بھی دیے اور کہا کہ ہمارے بازی مت کر، فوراً روانہ ہو جا۔ اگر تیرا اونٹ راستے میں بیکار ہو جائے تو فوراً دوسرے اونٹ کا انتظام کر۔ ابن زیاد یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس اصرار میں خود اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ شہادتِ امامؑ کی جتنی تفصیلات لوگوں تک پہنچیں گی وہ تاریخ کا جزو بن جائیں گی اور اتنا ہی اسکی اور زید کی رسوائی کا سامان جمع ہو جائیگا۔ امام عالی مقامؑ کو تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ امامؑ کا نقصان تو (اگر یہ تعبیر درست ہو) اس میں ہے کہ ان کی شہادت کی خبر ظاہر نہ ہو۔ دشمن کے اخلاقی بگاڑ اور اس کی غلط روی کا حال تاریخ میں درج نہ ہو اور موجودہ اور آئندہ مسلمان حقیقتِ حال سے بے خبر رہیں۔ ابن زیاد ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودتے ہیں اور اپنی ذلت و رسوائی کا سامان خود جگہ جگہ پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ درحقیقت خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۹)

آپ نے فرمایا: ”میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے جعفر کی آمد کی زیادہ خوشی ہے یا فتح خیبر کی۔“ پھر وہ دن جب ۱۰ھ میں حضرت جعفر زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن رواحہ کی موتہ (شام) میں شہادت کی خبر مدینہ آئی۔ پھر وہ دن جب رسول اللہ تیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ غزوہ تبوک سے صبح سلامت واپس تشریف لائے۔ یہ بڑا خطرناک سفر تھا۔ وہ دن جب رمضان ۱۰ھ میں رسول خدا نے مکہ فتح کیا۔ اس عظیم فتح کی خبر مدینہ پہنچی تو خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بت پرستی کی بساط ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے الٹ دی گئی۔ وہ دن جب ۱۰ھ کے اوائل میں رسول اللہ نے وفات پائی اور تمام اہل مدینہ غمزہ و سوگوار ہو گئے۔ آپ کی وفات کے بعد بھی مدینہ نے ایسے اہم تاریخی واقعات دیکھے جن سے کم و بیش مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی رہی۔

یہاں تک کہ ۱۰ھ آگیا اور چھ ماہ کی تشویش کے بعد بنی ہاشم اور مسلمانان مدینہ کو امام حسینؑ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کی شہادت کی خبر ملی۔ ایک دفعہ پھر رسول خدا کی وفات کا نقشہ نظروں میں گھوم گیا۔

### قتل حسین پر اظہارِ مسرت

شیخ مفید اور طبری لکھتے ہیں کہ جب امام حسینؑ کے قتل کے بعد ان کا سر عبید اللہ بن زیاد کے پاس لایا گیا تو اس نے عبد الملک بن ابی حارث سلمیٰ کو بلایا اور حکم دیا کہ فوراً مدینہ روانہ ہو جاؤ اور عمرو بن سعید بن عاص حاکم مدینہ کو جا کر حسین بن علیؑ کے قتل کا مرثوہ سناؤ۔

واقعی حیرت کا مقام ہے کہ رسول خدا کی وفات کے صرف پچاس سال

## مدینہ کے تاریخی ایام

ان دنوں مدینہ اہم تاریخی واقعات کی آماجگاہ تھا۔ وہ دن جب ۲۷ھ میں تین سو تیرہ مسلمانوں نے غزوہ بدر کبریٰ میں نو سو سپاس مشرکین مکہ پر فتح حاصل کی۔ ان کے ستر سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور ستر سے زیادہ کو قید کر لیا۔ اس فتح کا ثرہ مدینہ میں پہنچا اور رسول اکرمؐ اور مسلمان کامیاب و کامران اپنے گھروں کو لوٹے۔ وہ دن جب شوال ۳۷ھ میں مسلمانوں نے تین ہزار مشرکین مکہ کا مقابلہ کیا، ستر سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے اور رسول خداؐ اور مسلمان مجاہد غمزدہ اور سو گوار مدینہ واپس آئے۔ وہ دن جب ۳۸ھ میں چالیس یا ستر بزرگ صحابہ کی بیڑ مسوئہ میں شہادت کی تہرائی۔ وہ دن جب اسی سال نو صحابہ کی سریرہ اجمع میں شہادت کی خبر مدینہ پہنچی۔ وہ دن جب ۳۹ھ میں تین ہزار مسلمانوں نے جنگ خندق میں دشمن کے بارہ ہزار کے شکر پریا جیسا کہ مسعودی نے "التنبیہ والاشراف" میں لکھا ہے چوبیس ہزار کے لشکر پر فتح پائی اور تائید غیبی سے رسول خداؐ نے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ دن جب بالترتیب ۴۰ھ اور ۴۱ھ میں بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ اپنے کبفر کردار کو پہنچے اور مدینہ کی فضا ان پیمان شکن یہودیوں سے پاک ہو گئی۔ وہ دن جب ۴۲ھ میں مسلمانوں کو خیبر کے یہودیوں پر فتح حاصل ہوئی اور اس شاندار فتح کی خبر مدینہ پہنچی۔ وہ دن جب جعفر بن ابی طالب اور دوسرے مہاجرین جو تقریباً تیرہ سال قبل ہجرت کر کے مسیحی ملک حبشہ چلے گئے تھے بخبر و عاقبت واپس آئے اور رسول اللہؐ اس قدر مسرور ہوئے کہ



بیعت عقبہ کے بعد جس میں پچھتر افراد نے بیعت کی، جب قریش کو پتا چلا کہ قبیلہ اوس و خزرج کا رسول اللہ سے معاہدہ ہو گیا ہے اور انھوں نے آپ کی بیعت کر لی ہے تو قریش کا رویہ پہلے سے بھی سخت ہو گیا اور انھوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ ستانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی زندگی مکہ میں ناقابل برداشت ہو گئی تو انھوں نے رسول اللہ سے ہجرت کی اجازت طلب کی۔ آپ نے مدینہ جانے کی اجازت دیدی اور کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے بھائیوں کا اور جائے امن کا انتظام کر دیا ہے۔ تم اپنے انصار بھائیوں کے پاس چلے جاؤ چنانچہ تھوڑے تھوڑے مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ جاتے رہے اور خود رسول اکرم اللہ کے حکم کے منتظر رہے۔ اسی اثنا میں آپ کے قتل کی تجویز پر قریش میں اتفاق رائے ہو گیا۔ انھوں نے اپنی دانست میں قتل کا منصوبہ بڑی احتیاط سے بنایا تھا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اپنے پیغمبر کو وطن سے دور ایسے لوگوں کے پاس پہنچانا چاہتا تھا جو باپ بھائی سے زیادہ مہربان اور جان نثار ہوں۔ چنانچہ آپ ماہ ربیع الاول ۳۱ سال بعثت کی چاند رات کو مکہ سے نکلے۔ رات کو غار ثور میں پوشیدہ رہے اور پھر دو مسلمانوں اور ایک مشرک کے ساتھ جسے بطور رہبر اجرت پر ساتھ لیا تھا مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ بارھویں بیع الاول کو مدینہ کے محلہ قبا میں اترے۔ اہل مدینہ نے پر جوش تیر مقدم کیا اور شہر خوشی کے نغموں سے گونج اٹھا۔

”کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے — چاند نکل آیا ہے

جب تک کوئی پکارنے والا خدا کو پکارے

ہم پر خدا کا شکر واجب ہے“

دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس چلے جائیں اور ہم بے سہارا رہ جائیں“

رسول اللہ نے مسکرا کر کہا: ”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میرا خون تمہارا خون اور میری عزت تمہاری عزت ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ جس کے ساتھ تمہاری جنگ ہوگی میں اس کے ساتھ جنگ کروں گا اور جس کے ساتھ تمہاری صلح ہوگی، اس کے ساتھ میں صلح کروں گا“

اس پر سب انصار پکار اٹھے کہ ہمیں رسول اللہ کی بیعت منظور ہے اور ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ ان کے لیے ہمارے بزرگ جان دیں اور ہم سب مال و متاع ان پر سچھا کر دیں۔

عباس بن عبد المطلب، رسول اللہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: ”آہستہ بات کرو۔ جاسوس لگے ہوئے ہیں۔ سن رسیدہ لوگوں کو آگے رکھو تا کہ وہ ہم سے بات کر لیں اور بیعت کے بعد منتشر ہو جاؤ۔ ہر شخص واپس اپنی جگہ پر چلا جائے“

سب سے پہلے براء بن معرور نے اور ایک قول کے مطابق ابوالمہشم بن تیہان نے اور ایک دوسرے قول کے مطابق اسعد بن زرارہ نے بیعت کی۔ اس کے بعد ستر اشخاص نے رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے اسی گروہ میں سے بارہ نقیب منتخب کیے اور انھیں ذمے دار ٹھہرایا کہ اپنی قوم کے حالات کی نگرانی کریں۔ اس طرح شہر یشرب جس کا نام ہجرت نبوی کے بعد مدینۃ الرسول ہو گیا، دعوت اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ فی الحج ۳ سالہ ہجرت سے مدینہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کا آغاز ہوا اور پوری

دیکر بھی تم ان کے وفادار رہو گے تو پھر ان کا دامن ہرگز نہ چھوڑو کیونکہ وہ نبی اور آخرت کی بھلائی اسی میں ہے“

اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم جان و مال کی قربانی پر خوشی سے بیعت کے لیے آمادہ ہیں۔ پھر انھوں نے رسول خدا سے پوچھا: اگر ہم آپ کے وفادار رہیں تو ہمیں کیا ملے گا۔“

آپ نے فرمایا: ”جنت“

انھوں نے کہا: ”تو پھر لائیے ہاتھ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں“  
ابن اسحاق کی روایت کے مطابق رسول اللہ نے اپنی گفتگو کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔ پھر اسلام کی دعوت دی اور اس کے بعد فرمایا کہ میں تمھاری بیعت اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ تم میری اس طرح حمایت کرو گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہو۔

براع بن معرور نے رسول خدا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا۔ ہم آپ کا اسی طرح دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے ناموس اور اپنی خواتین کا کرتے ہیں۔ اے رسول خدا! ہماری بیعت قبول کر دیجیے۔ خدا کی قسم ہم لوگ جنگ آزمودہ ہیں اور سپہ گری تو پشت ہا پشت سے ہمارا پیشہ ہے۔“

اس پر ابو ایبشہم بن تیمان نے جو ایک بزرگ انصاری اور شہدائے صفین میں سے تھے، براع بن معرور کی بات کاٹ کر کہا یا رسول اللہ! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان تعلقات ہیں جو اب منقطع ہو جائیں گے ایسا نہ ہو کہ ہم تو اپنے حلیفوں کو آپ کی خاطر چھوڑ دیں اور جب آپ کو خدا کا مہمانی

معزز و محترم ہیں۔ ہم میں ان کا ایک خاص مقام ہے ہم سب بنی ہاشم چاہے ان پر ایمان لاتے ہوں یا نہ لاتے ہوں ان کے جاں نثار ہیں اور ہمیشہ ان کے لیے سینہ سپر رہے ہیں۔ اپنے شہر اور قبیلے میں محمد کی عزت ہے اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اب وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم ان کا ساتھ دے سکو، دشمنوں سے ان کی حفاظت کر سکو اور سب عربوں کے مقابلے میں جو تم سے لڑنے آئیں گے ثابت قدم رہ سکو تب تو بہتر ہے لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انہیں اپنے شہر میں لیجا کر ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو ابھی سے جواب دیدو۔ آپس میں صلاح کر کے فیصلہ کر لو۔ فیصلے کے بغیر یہاں سے نہ جاؤ کیونکہ صاف بات ہی اچھی ہوتی ہے۔“

اس پر بڑا عربی معرور نے جو ایک بزرگ صحابی تھے کہا: ”ہم نے تمہاری بات سن لی۔ بخدا اگر ہمارے دل میں کچھ اور خیال ہوتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے، ہم اس بات پر قائم ہیں کہ ہم رسول خدا کا پورا پورا ساتھ دینگے اور راہِ خدا میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“

عباس بن عبادہ نے کہا: ”گروہ خزر جہاں جاتے ہو تم کس بات پر ان صاحب کی بیعت کر رہے ہو جو لوگوں نے کہا ہمیں معلوم ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم اس پر بیعت کر رہے ہو کہ جنگ میں ان کا ساتھ دو گے اور جان و مال کی قربانی سے بچھ نہیں ہٹو گے۔ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یہ دیکھ کر کہ مال ہاتھ سے جا رہا ہے اور قوم کے بزرگ مارے جا رہے ہیں، کسی وقت ساتھ چھوڑ دو گے تو بہتر ہے کہ ابھی سے بیعت کا خیال دل سے نکال دو۔ کیونکہ ایسی بات سے دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی۔ ہاں اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جان و مال کی قربانی

رسول اللہ ﷺ ستر قیدیوں اور بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس آئے ہیں یا ستر سے زیادہ جان نثاروں کی شہادت کے بعد صرف دست و پا شکستہ اصحاب کو لیکر جنگِ احد کے بعد انصاری مرد اور خواتین کے عکس العمل کا جو اثر دشمن کے حوصلوں پر ہوا تھا وہی اثر کوفہ اور شام میں اہلبیتؑ کے طرزِ عمل کا ہوا۔ اہلبیتؑ کا طرزِ عمل بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس قدر مصائب و شدائد برداشت کرنے کے بعد بھی سرا و پوچھا کہ سبکس گئے ہر جگہ تقریریں کر سکیں گے اور فاتح اور طاقتور دشمن کو نیچا دکھائیں گے عام خیالات کے بدلنے سے خود بزمِ بد پر یہ اثر ہوا کہ اسیرانِ اہلبیتؑ کے دشمن پہنچنے پر پہلے ہی دن اس نے یہ کہا: ”ابنِ مرجانہ پر خدا کی مار۔ اگر اس کی تمھارے ساتھ رشتے داری ہوتی تو وہ ہرگز تمھارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا اور تمھیں اس افسوسناک حالت میں نہ بھیجتا“

### انصارِ مدینہ کی بیعت

نبوت کے تیرھویں سال مدینے کے سربراہ اور وہ لوگوں نے منیٰ کی گھائی میں رسولِ خدا کی بیعت کی۔ عباس بن عبدالمطلب اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے اہل مدینہ سے عہد لیا کہ رسولِ خدا کی حمایت میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عباس نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

”اے گروہِ خزرج! اب جبکہ تم محمدؐ کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے رہے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ اپنے خاندان میں بہت

اور بہت سے گرفتار ہوئے تھے لیکن یہ طرز فکر کہ جنگ بدر مسلمانوں کے لیے اور اسلام کی ترقی کے لیے جنگ احد سے زیادہ نفع بخش تھی اس بات کا نتیجہ ہے کہ جنگ احد کے جو آثار مرتب ہوئے تھے ان پر پوری توجہ نہیں دیکھی۔ بدر میں مسلمانوں نے اپنے زور بازو کا مظاہرہ کیا تھا۔ دشمن کو معلوم ہو گیا تھا کہ اگر مسلمان تین سو تیرہ بھی ہوں اور ان کے پاس صرف چھ زہریں اور سات تلواریں ہوں تب بھی وہ نوسو پچاس افراد کے لشکر پر بھاری رہیں گے۔ کچھ کو مار دینگے، کچھ کو قید کر لیں گے اور باقی کو بھگا دیں گے لیکن ابھی قریش کو اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ اگر کسی دن اہل مدینہ کے ائزرہ واقربا راہ خدا میں شہید ہو جائیں گے تو وہ عورتیں جن کے شوہر بھائی، بیٹے جنگ میں مارے گئے ہوں رسول خدا کی سلامتی پر اظہار مسرت کریں گی اور اگر کسی دن رسول اللہ زخمی مسلمانوں کو دشمن کا تعاقب کرنے کا حکم دینگے تو وہ زخموں پر پٹیاں باندھ کر اس طرح در درینگے جیسے انھیں ذرا بھی چوٹ نہ آئی ہو جنگ احد دشمن کو مرعوب کرنے میں جنگ بدر سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ احد کے امتحان میں مسلمانوں نے بدر سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فتح و کامرانی کے موقع پر تو لوگ بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جب شکست و ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور حوصلہ پست ہو جاتے ہیں۔ جنگ بدر کے بعد بھی قریش کو امید تھی کہ اگر وہ کسی دن مسلمانوں پر غالب آگئے اور انصار کے کچھ آدمی مارے گئے تو رسول خدا کی نصرت و اعانت کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائیگا اور وہ بد دل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دینگے۔ یہ تو ان کے حاشیہ خیال ہیں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ

کے شوہر، بھائی اور باپ شہید ہو گئے تھے۔ جب اسے اپنے عزیزوں کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے پوچھا۔ رسول اللہ کس حال میں ہیں؟ لوگوں نے کہا: رسول اللہ خیریت سے ہیں، انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ کہنے لگی: میں خود رسول اللہ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب رسول اللہ کو دیکھ کر اطمینان ہو گیا تو کہا: آپ خیریت سے ہیں تو پھر کوئی بھی مصیبت آئے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اگر ایک عورت جو پہلے بت پرست اور گمراہ تھی، اسلامی تربیت اور رسول کی تعلیم کے نتیجے میں ایمان و اخلاص اور راہِ حق میں جاں نثاری کے اس درجے پر پہنچ سکتی ہے کہ رسول خدا کو زندہ سلامت پا کر وہ ہر غم بھول جاتی ہے اور ہر مصیبت کو حقیر سمجھنے لگتی ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اس تربیت اور تعلیم کا علیٰ وفاظمہ کی بیٹی پر کیا اثر ہوا ہوگا اور وہ ایمان و اخلاص اور خداکاری کے کس مرتبے پر پہنچ گئی ہوں گی۔ اگر اوس و خزرج کی مسلمان خواتین اس درجہ روحانی عظمت کا اظہار کر سکتی تھیں تو زینب کبریٰؑ کی روحانی بلندی کا کیا کہنا۔ تب ہی تو اتنی مصیبتوں کے بعد بھی انھیں وہ قلبی اطمینان اور روحانی سکون حاصل تھا کہ انھوں نے فرمایا: ”میں نے تو کوئی بری بات نہیں دیکھی“ یہی راز تھا مسلمانوں کی عظمت اور ان کی حیرت انگیز ترقی کا۔ یہ نور ایمان کی روشنی تھی جس نے دشمن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اور اس کے کس بل نکال دیے تھے۔

شاید کوئی کہے اور شاید کہتا ہوں میں بھی لکھا ہے کہ جنگِ احد میں مسلمانوں کو بڑی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ کتنے ہی مسلمانوں کے عزیز شہید ہو گئے البتہ جنگِ بدر میں خوب کامیابی ہوئی تھی۔ دشمن کے بہت سے آدمی مارے گئے

صحت پریشان تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہندہ سے پوچھا کہ کیا خبر ہے؟  
انہوں نے کہا۔ بڑی اچھی خبر ہے۔ رسول اللہ زندہ سلامت ہیں۔ اس کے  
علاوہ کوئی بھی مصیبت آئے تو کوئی بات نہیں۔

یہ مسلمان خاتون جو اپنے عزیزوں کی لاشیں مدینہ میں دفن کرنے کے لیے  
لے جا رہی تھیں ان کی قوتِ ایمانی کس قدر زبردست تھی، ان کا حوصلہ کتنا  
بلند تھا کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ زندہ ہیں تو پھر کیا غم! اس خوش خبری کے  
ہوتے ہوئے کون سی خبر ہے جو ہمیں افسردہ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے  
کہا کہ میں احد سے اور بھی کئی خوشخبریاں لائی ہوں۔ ایک تو یہ کہ منقرض مسلمانوں  
کو شہادت کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوسری یہ کہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:

وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا  
وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا

عَزِيزًا (سورہ احزاب آیت ۲۵)

”اللہ نے غصے میں بھرے ہوئے کافروں کو پسا کر دیا۔ انہیں کچھ  
فائدہ نہیں ہوا اور اللہ نے مسلمانوں کو مزید خون خرابے سے بچا  
لیا۔ اللہ قدرت والا اور عزت والا ہے“

یعنی کافر غصے میں پہنچ و تاب کھاتے ہوئے واپس گئے ہیں کیونکہ انہیں  
کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس خاتون سے پوچھا گیا کہ اونٹ پر کیا لاد رکھا ہے؟  
کہا میرا بھائی، میرا بیٹا اور میرا شوہر شہید ہو گئے ہیں، ان کی لاشیں مدینہ  
لے جا رہی ہوں۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اسی جنگِ احد میں نبی دینار کی ایک عورت



مارے جائیں، اسکے بیٹے شہید ہو جائیں، دس بھتیجے اور چچا زاد قتل ہو جائیں اور اس کے بعد اسے اس کی بہنوں اور اس کے بھائیوں کی اولاد کے ساتھ قید کر لیا جائے اور وہ پھر بھی اسیری و گرفتاری کے باوجود اپنا اور اپنے شہیدوں کا دفاع کرے اور وہ بھی اس شہر میں جو کبھی اس کے باپ کا دارالحکومت تھا اور جہاں وہ اپنے باپ کی حکومت کے دوران میں تقریباً چار سال رہی تھی بسکن غم زدگی اور افسردہ دلی کے تمام اسباب جمع ہونے کے باوجود اپنی مصیبت کا کوئی کلمہ شکوہ نہیں کرتی بلکہ صاف کہتی ہے کہ کوئی بات خلاف توقع نہیں ہوئی ہے۔ اگر ہمارے مرد شہید ہو گئے تو وہ آئے ہی اسی لیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل بیت پریشانی کی بات تھی۔ اب جبکہ انھوں نے اپنا مقدس فرض انجام دے دیا ہے اور شہادت کا رتبہ پایا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اس کا میاں پر خدا کا شکر ادا کیا جائے۔

### اسلامی تربیت کا اثر

واقعی کی روایت ہے کہ جنگ احد میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے یہاں تک کہ خود رسول خدا کی شہادت کی خبر مشہور ہو گئی تھی۔ ایک انصاری خاتون ہندہ بنت عمرو بن حزام، جو حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری کی بھوپھی تھیں، احد آئیں اور اپنے شہیدوں یعنی اپنے بیٹے خالد، اپنے شوہر عمرو بن جموح اور اپنے بھائی عبد اللہ بن عمرو کی لاشوں کو فرشِ خاک سے سمیٹا اور تینوں شہیدوں کو ایک اونٹ پر بار کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ راستے میں ازواجِ رسولؐ سے ملاقات ہوئی جو رسول اللہ کی شہادت کی خبر پاکر احد کی طرف جا رہی تھیں اور

شام پہنچ کر اس کا اثر زائل کر دیا۔ دمشق کے بازار میں آیہ تطہیر سمانی اور اہلبیتؑ رسولؐ کے حقوقی بیان کیے۔ آخر غمزہ اور سوگوار ہونے کے باوجود مطمئن اور آسودہ خاطر مدینہ واپس آئے۔ شاید بعض شیعیاں اہلبیتؑ کو مطمئن اور آسودہ خاطر کے الفاظ گراں گزریں مگر ان کا مہیا بیوں کو نظر میں رکھیں جو اہلبیتؑ کو اس سفر میں حاصل ہوئیں اور جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں تو وہ خود اعتراف کریں گے کہ اہلبیتؑ کے جذبات کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ نامناسب نہیں۔ ہم سے قبل خود دختر امیر المؤمنینؑ نے اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور ہم نے اسی عظیم المرتبت خاتون کی پیروی کی ہے جس کی دیری اور صاف گوئی کی مستند شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

ابن طاووس کی روایت ہے کہ جب ابن زیاد نے حضرت زینبؑ کو لے کر کہا: ”دیکھا خدا نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کیا، تو زینبؑ نے جواب میں کہا کہ میں نے تو کوئی بری بات نہیں دیکھی۔ ان لوگوں کی شہادت مقرر تھی سو وہ خلد بریں میں چلے گئے۔ عنقریب اللہ تجھے اور انھیں اکٹھا کرے گا، پھر جھگڑے کا فیصلہ ہو گا۔ دیکھیں کس کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے۔ اے پسر مر جانہ! تیری ماں تجھ پر روئے“

سلام ہو آپ پر اے ثانی زہرا! آپ نے قید کی حالت میں بھی اسی صاف گوئی سے کام لیا اور وہ بھی اس شخص کے سامنے جسے اہلبیتؑ سے پشتینی دشمنی تھی۔ ہمارے خیال میں دختر علیؑ کے حوصلے اور جرأت کی یہ مثال ان خطبوں سے بھی زیادہ وقیع ہے جو انھوں نے کوثر اور شام میں دیے تھے۔

انسانیت کی تاریخ میں اور کون عورت ہوگی جس کے چھ یا سات بھائی

کے یعنی عون اور محمد پانچ افراد اولادِ عقیل ہیں سے یعنی جعفر بن عقیل، عبدالرحمن بن عقیل، مسلم بن عقیل کے دو بیٹے عبداللہ اور محمد اور ایک محمد بن ابی سعید بن عقیل۔ ان سترہ افراد کے نام زیارتِ ناحیہ میں آئے ہیں۔ ان کے علاوہ امام ۴ کے ہمراہی تقریباً پچاس سے زیادہ نہیں تھے۔ اگر شروع میں کچھ تھے بھی تو کوفہ اور عراق کی صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آج امام ۴ کے حامیوں اور محبوں کی گنتی کی جائے تو شمار سے باہر ہے لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس زمانے کے لوگ بہت برے تھے اور آج کے لوگ امام شناسی اور جاں نثاری میں ان سے بڑھ گئے ہیں؟ یہ بات نہیں جب تک امتحان کی توبت نہیں آئی تھی اور مسلم اور ہانی قتل نہیں ہوئے تھے امام ۴ کے عقیدہ تہذیبے شمار تھے اور امام ۴ کے ارد گرد درود و سلام کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بہت ہی اچھا دور تھا جس میں امام کو چھ ٹینے کے مختصر عرصے میں بہتر روشن ضمیر اور ثابت قدم ساتھی ملیں آ گئے تھے۔ امام کو اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کشور کشانی کے لیے تو نکلے نہیں تھے کہ بڑا لشکر درکار ہوتا۔ امام کے مقصد کے لیے یہی بہتر عظیم المہر تبت افراد جن میں ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھا کافی تھے۔ انکے علاوہ وہ باہمت اور بزرگ خواتین تھیں جنہوں نے ہر حالت میں اپنی بات کہہ کر تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ مردانہ وار خدمات سناستہ انجام دیں اور دستِ بستی عاشورے کے واقعات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پانی بند کرنے، گھوڑے دوڑانے اور طفل شیر خوار کے قتل کا اجرا سنایا۔ دمشق اور اس کے گرد و نواح کے لوگ پچھلے بیالیس سال سے اہلبیت کے متعلق گمراہ کن پراسپیڈے کا شکار تھے۔ انھوں نے

شانے اور باروبیکار نہ ہو جاتے تو تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ امام کے ساتھیوں میں نافع پہلے شخص تھے جنہیں گرفتار کر کے ان کی گردن مار دی گئی۔

مرتے دم بھی انہوں نے اپنے ایمان اور یقین کامل کا مظاہرہ کیا جب انکا سرفکرم کرنے کے لیے تلوار اٹھانی گئی تو انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت بدترین لوگوں کے ہاتھوں لکھی تھی۔

یہ حوصلہ تھا ان لوگوں کا جن پر سلام بھیج کر ہم کہتے ہیں ”يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوْزَ مَعَكُمْ“ کاش ہم بھی تمہارے ساتھ ہوتے تو تمہاری طرح سرفراز و سرخرو ہوتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس وقت وہاں نہیں تھے۔ اس امتحان اور ابتلاء سے بچ گئے اور آپ جیسے بزرگوں کا خون بہانے میں شریک نہیں ہوئے لیکن وہ دن حقیقت سے نزدیک تر تھا یا یہ شکر گزاری؟

### آل ابی طالب جو کر بلا میں شہید ہوئے

۳۱ھ میں امام حسینؑ مدینہ سے مکہ گئے اور وہاں سے کوفہ کے قریب تک پہنچے۔ ہر جگہ انہوں نے لوگوں کو اپنی حمایت اور حق کے دفاع کی دعوت دی، تقریریں کیں۔ اس کارروائی میں چھ ماہ سے زیادہ لگے لیکن مشہور یہی ہے کہ بہتر سے زیادہ مخلص افراد نہ مل سکے۔ ان میں بھی سترہ تو آل ابی طالب تھے دو خود امامؑ کے فرزند یعنی علی اکبرؑ اور طفیل شیر خوار تین امام حسنؑ کے فرزند یعنی قائمؑ عبد اللہ اور ابو بکرؑ یا ساج امامؑ کے بھائی یعنی عباسؑ عبد اللہ، جعفر اور عثمانؑ یہ چاروں تو امامؑ کے بیٹے تھے اور پانچویں محمد بن علیؑ دو بیٹے عبد اللہ بن جعفر

جائے تو میرے یقین میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا۔ اب امام علیؑ نے یہ بات کہی ہو یا نہ کہی ہو اس میں شک نہیں کہ وہ یقین کے اسی مرتبے پر تھے اور یہ کوئی غیر متوقع بات بھی نہیں۔ امیر المومنینؑ کا تو یہ مرتبہ ہونا ہی چاہیے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ زبیر بن عیینہ کو بھی ایک حد تک یہ مقام حاصل تھا۔ انھوں نے جو کچھ امامؑ سے کہا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ زبیر جو امامؑ کا عقیدت مند اور جاں نثار ہے، امامؑ کی صحبت میں رہ کر اس درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو اس کے یقین میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ یہی یقین اور ضمیر کی روشنی تھی جس نے اصحابِ امامؑ کو ہر آزمائش میں لغزش سے محفوظ رکھا۔

ناصح بن ہلال بجلی، امامؑ کے ہمراہیوں میں سے تھے۔ دشمن پر تیسرے چلاتے جاتے اور درجز پڑھتے جاتے تھے۔ میں ہلال بجلی ہوں، میں دین علیؑ پر ہوں یعنی عینِ معرکہ کارزار میں بھی نامِ علیؑ کی تبلیغ سے غافل نہیں تھے۔ علیؑ کا نام لے رہے تھے اور ان کی مدح میں مشغول تھے۔ یہاں تک کہ عمرو بن سعد کے بارہ آدمیوں کو قتل اور متعدد کوزہ چھی کیا۔ آخر بازو ٹوٹ گئے، مضطرب ہو گئے تو دشمن نے گرفتار کر لیا۔ ابن سعد کے پاس لے جایا گیا تو اس نے پوچھا: نافع! تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی؟ شاید ابن سعد کا خیال تھا کہ اکثر لوگوں کی طرح یہ بھی پیشانی کا اظہار کر کے معافی مانگیں گے مگر نافع نے کہا: خدا میری نیت سے واقف ہے۔ اس وقت ان کی ڈاڑھی سے خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے پھر بھی ہمت کر کے کہا کہ میں نے تمہارے بارہ آدمیوں کو قتل کیا ہے اور بہت سوں کو زخمی بھی کیا ہے۔ مجھے اس پر قطعاً پیشانی نہیں ہے۔ اگر میرے

پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے ”یا لیتنی کنت معکم فافوز معکم“ وہ ذرا سوچے اور دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے کہے کہ اس کا یہ فقرہ سچ شمار ہوگا یا جھوٹ؟ کیا واقعی اس کی یہ آرزو ہے کہ کاش وہ عابس بن ابی شیبہ شاکری کے ہمراہ ہوتا اور انہی کی طرح دشمن کی سنگ باری کے وقت سر سے خود اور جسم سے زرہ ہٹا دیتا اور حق کی حمایت میں اس کا جسم پتھروں سے کچلا جاتا؟ یا اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ امامؑ کے ہمراہیوں نے کیا کارنامے انجام دیے ہیں اور کس ہمت و جرات سے دشمن کے دار سے ہیں؟ اسی لیے ان کی ہمراہی کی آرزو کرتا ہے۔ اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ اصحاب امامؑ کی نورا نیت اور ان کا ایمان تو اس درجہ پر تھے کہ وہ امامؑ کی تسلی کے لیے جو کچھ کہتے تھے اس میں بھی یقین کا نور جھلکتا تھا۔

### اصحاب حسینؑ منزل یقین پر

طبری نے لکھا ہے کہ زہیر نے نماز ظہر کے بعد سخت جنگ لڑی۔ وہ کہتے جاتے تھے: میں زہیر بن قین ہوں۔ میں اپنی تلوار سے حسینؑ کو دشمنوں سے بچا رہا ہوں۔ انھوں نے امامؑ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا: آگے بڑھیں، آپ تو ہادی اور مہدی ہیں۔ آج آپ نبی کریمؐ، حسن مجتبیٰؑ، علی مرتضیٰؑ، جعفر طیار اور حمزہؑ سے ملاقات کریں گے۔

زہیر یقین کے اس مرتبے پر فائز تھے کہ اپنے امامؑ کو تسلی دے رہے تھے کہ دلگیر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ عجب نہیں۔ جیسا کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا ہو: ”اگر میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا

خدا کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرو۔ تمہارا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارا نفع اور نقصان میرے ہاتھ میں نہیں البتہ تم میرے رشتہ دار ہو اور میں تمہارے ساتھ عزیز داری کا برتاؤ ضرور کروں گا۔

اگر رسول اللہ سے رشتے داری ایمان اور عمل صالح کی جگہ نہیں لے سکتی اور دختر رسول کے لیے بھی ضروری ہے کہ حسن عاقبت کے لیے وہی راستا اختیار کرے جو دوسروں کے لیے ضروری ہے بلکہ خود رسول خدا کے لیے بھی رضائے الہی حاصل کرنے کا ایمان اور عمل صالح کے سوا کوئی راستا نہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد یہ سب آیات قرآنی، احادیث نبویؐ اور بیعت البلاغہ کے خطبے منسوخ سمجھ لیے جائیں اور بہشت میں جانے کا ایمان اور اعمالِ حسنہ کے سوا کوئی اور راستا نکل آئے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واقعہ کربلا سے پہلے تو مسلمانوں کو صداقت و امانت، عبادات و واجبات شرعی کی پابندی اور دروغ گوئی، شراب نوشی، سود خوری اور اکل حرام سے پرہیز کی ضرورت تھی لیکن اب یہ باتیں اتنی ضروری نہیں رہیں؟ اب یہ ممکن ہے کہ چاہے کوئی ظلم و ستم میں قاتلان حسینؑ سے بھی بازی لے جائے لیکن امامؑ اور اصحاب امامؑ پر درود و سلام بھیج کر مطمئن ہو جائے کہ وہ حشر میں ان ہی بزرگوں کے ساتھ ہو گا۔ اصحاب حسینؑ تو روحانی عظمت، خلوص، ایمان اور راستگوئی کا پیکر تھے۔ انہی کے حالات پڑھ کر ہم ہوا خواہی اور طرفداری کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں۔ اصحاب امامؑ ہی نے ہمیں عشق، ایمان، جان نثاری اور طرفداری کا مطلب بتایا ہے حتیٰ کہ ان کے وہ رجز بھی جو انہوں نے روزِ عاشورا دشمن کے مقابلے میں پڑھے، ان کی شخصیت اور روحانی عظمت

نظر انداز کر دی جائیں گی۔ مندرجہ بالا آیت کے نزول پر آپ نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا: ”اے قریش! اپنے آپ کو آتش جہنم سے بچاؤ کیونکہ تمہارا نفع اور نقصان میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

مطلب یہ تھا کہ نفع یا نقصان اور ثواب یا عذاب کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ اچھا کام کر کے تو فائدہ ہوگا اور ثواب ملے گا۔ برا کام کر دے تو نقصان اٹھا دے گا اور سزا یاؤ گے۔ پھر آپ نے فرمایا: لے اولادِ لعب بن لوی! اپنے آپ کو آتش جہنم سے بچاؤ کیونکہ تمہارا نفع و نقصان میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اے بنی قحطی! اپنے آپ کو آتش دوزخ سے بچاؤ۔ میں تمہیں ثواب دلا سکتا ہوں نہ عذاب سے بچا سکتا ہوں۔ اے بنی عبدمناف! تم خود اپنے آپ کو عذابِ الہی سے بچانے کی کوشش کرو کیونکہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کو مانو گے تو بہشت میں جاؤ گے، مشرک رہو گے تو دوزخ میں ہو گے۔ میرے پاس ایسی کنجی نہیں ہے کہ اپنے مشرک رشتہ داروں کو چور دروازے سے بہشت میں پہنچا دوں۔ مجھے اس کا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ان فرائض سے معافی دلا دوں جو خدا کی طرف سے عاید کیے گئے ہیں۔ لے بنی زہرہ بن کلاب! خود کو عذاب سے بچاؤ۔ لے بنی عبدالمطلب! وہ کام کر دو کہ عذاب سے بچو۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ لے بنی ہاشم! لے بنی عبدشمس! خدا پرستی کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے بچاؤ۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ چچا عباس! آپ مجھی اپنے آپ کو عذاب سے بچائیں۔ بھوپھی صغیبہ! آپ بھی اپنے بچاؤ کی فکر کریں کیونکہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ دنیاوی فائدہ میرے ہاتھ میں ہے نہ آخرت کا نفع۔ خدا پر ایمان لاؤ اور کہو لا الہ الا اللہ لے فاطمہ دختر محمد! تم بھی



کوئی پارٹے گا نہ مذکر اور جو مرد یا عورت کوئی نیک کام کرے گا  
بشرطیکہ مومن ہو تو جنت میں داخل ہوگا اور کسی پر ذرا بھی ظلم  
نہیں ہوگا“

یعنی ثواب و عقاب اور سزا و جزا کا تعلق تمھاری یا اہل کتاب کی خواہش  
سے نہیں۔ قانون الہی نہ تمھاری خاطر بدل سکتا ہے نہ اہل کتاب کی۔ قانون یہی  
ہے کہ جو شخص کوئی برائی کریگا وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ خدا کے سوا کوئی اس کی  
مدد نہیں کر سکتا اور جو با ایمان مرد یا عورت نیک اور صالح ہوگا، وہ جنت  
میں جائے گا۔ کسی کے ساتھ ذرا بھی نا انصافی نہیں ہوگی۔

### دَعْوَتِ ذُو الْعَشِيرَةِ

جب رسول اکرمؐ کو دین اسلام کی علانیہ تبلیغ کا حکم ہوا اور آیت انذار  
وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ (اپنے قریبی رشتے داروں کو خدا  
کے عذاب سے ڈراؤ اور انھیں دین حسین اسلام کی دعوت دو) نازل ہوئی تو  
آپ نے اسی دن بار بار اپنے عزیزوں سے کہا کہ میری رشتے داری کے بھروسے  
پر خدا کی بندگی سے منہ نہ موڑو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ معاملہ میرے ہاتھ میں  
نہیں ہے۔ سنت الہی کے برخلاف نہ میں تمھیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہوں اور  
نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ اگر تمھیں کوئی نفع پہنچے گا تو اسی طریقے سے  
پہنچے گا جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ بھی قانون الہی  
کے مطابق ہی ہوگا۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ قریش کی یا بنی ہاشم کی یا بنی عبدمناف  
کی یا بنی عبدالمطلب کی یا میری بیٹی فاطمہؑ کی یا میری بیٹی زینبؑ کی غلطیاں

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ بَلَىٰ مَنْ  
كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ  
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

”اور یہودیوں نے یہ بھی کہا کہ آنٹش دوزخ ہمیں چند روز سے  
زیادہ نہ چھوٹے گی۔ ان سے کہہ دو کہ کیا اس بارے میں تم نے  
اللہ تعالیٰ سے کوئی معاہدہ کر لیا ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہ کریگا  
یا اس سے ایسی بات منسوب کرتے ہو جس کے بارے میں تمہیں  
کوئی علم نہیں“

اس کے بعد قانونِ خداوندی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا:  
”بات یہ ہے کہ شخص قصداً برائی اختیار کرتا ہے اور اس کے قصور  
اس طرح اس کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ نیکی کا اثر باقی نہ رہے تو ایسے لوگ دوزخی  
ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے“  
سورہ نساء کی آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں بھی یہی بات زیادہ واضح اور  
جامع انداز میں کہی گئی ہے:

لَيْسَ بِأَمَانَتِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَن يَعْمَلْ  
سُوًّا يُجْزِيهِ وَلَا يُجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ○  
وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ  
مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظَاهَمُونَ نَقِيرًا ○

”نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے نہ اہل کتاب کی تمتاؤں  
سے، جو کوئی برائی کریگا وہ اس کی سزا پائے گا اور اسے خدا کے سوا

اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنینؑ اس سے ناامید ہو گئے تھے کہ لوگوں کو مذہبی جذبات کی بنا پر جہاد پر آمادہ کیا جاسکتا ہے اسی لیے انھوں نے قومی جذبات کا سہارا لیا اور فرمایا کہ اگر تم ثوابِ آخرت کے حصول کے لیے جہاد پر آمادہ نہیں ہو تو کم از کم اس بڑے انجام سے ڈرو جو جہاد نہ کرنے کی صورت میں مرتب ہوگا۔ سنتِ الہی تغیرنا پذیر ہے۔ اگر تم ثوابِ اخروی نہیں چاہتے تب بھی اپنی عزت اور آزادی کے بچاؤ کے لیے اٹھو اور اپنے ملک کی سرحدیں دشمن کے تعرض سے بچاؤ۔ قوموں میں اپنی عزت و آبرو نہ گنواؤ۔ دشمن کو یہ موقع نہ دو کہ وہ تمہیں بے بس کر دے۔

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ کہتے ہیں: دیکھو میں رات دن تنہائی میں اور سب کے سامنے تم سے کتنا ربا ہوں کہ تم ان لوگوں کا مقابلہ کرو اور اس سے پہلے کہ وہ تم پر حملہ کریں تم ان پر حملہ کرو۔ جس قوم پر خاص اس کے گھر میں اندر آکر دشمن حملہ کر دے وہ ذلیل ہو جاتی ہے لیکن تم سستی برتتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تم پر حملے ہونے لگے اور بہت سے علاقے تمہارے ہاتھ سے نکل گئے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں واضح طور پر اس امر کی طرف توجہ دلانی گئی ہے کہ وہم میں مبتلا ہو کر حقیقت کی طرف سے چشم پوشی نہ کرو۔

سورہ بقرہ کی آیات ۸۰-۸۱ میں زمانہ رسالت کے یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۗ قُلْ أَتَّخَذُ تُمُرًا عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ

یہ سب باتیں سنتِ الہی کے خلاف ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے اصحاب کو سنتِ الہی کے تغیرنا پذیر ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کے اصحاب اور شیعہ ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ سنتِ الہی کو بدلا جا سکتا ہے اور جن باتوں سے دنیا پھر کے اور لوگوں کو نقصان پہنچا ہے وہ ان کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہیں اور جن کاموں نے دوسروں کو کمزور اور ذلیل کیا ہے وہ ان کے ذریعے عزت اور طاقت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اور خطبے میں امیر المؤمنینؑ نے جہاد کے بارے میں فرمایا: ”جو جہاد کو ناپسندیدہ سمجھ کر اس سے روگردانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کر دیتا ہے۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اسے انصاف نہیں ملتا۔“

یہاں بھی امام علیؑ نے راہِ خدا میں جہاد کرنے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے کی فضیلت اور ثواب کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ جو جہاد نہیں کرتا اور اپنے وطن کا دفاع نہیں کرتا اس کا روزِ قیامت یہ حشر ہو گا: امیر المؤمنینؑ نے اپنے بیان میں ثواب و عذاب کی بات نہیں کی۔ انھوں نے ایک قانونِ الہی کی طرف توجہ دلائی کہ جو قوم جہاد کا فریضہ ادا نہیں کرتی اور اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کرتی تو خواہ اس کے پیغمبر خاتم الانبیاءؑ اور امام امیر المؤمنینؑ ہی کیوں نہ ہوں، ذلیل بے بس اور کمزور ہو جاتی ہے، قوموں کی برادری میں ذلیل و خوار ہو جاتی ہے، عقل و فراست کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے، جہاد اور دفاع کے فریضے سے پہلو تہی کے نتیجے میں اپنا حق کھو دیتی ہے اور حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ ایسی قوم کے ماتھے پر ذلت کا داغ لگ جاتا ہے اور کوئی

سربراہ کوئی ظالم ہو تو اس گروہ میں اتفاق و اتحاد کے باوجود اسے کامیابی نہ ہو۔ قانون الہی یہی ہے کہ پہلا گروہ باہمی اختلافات اور اپنے سربراہ کی نافرمانی کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوگا اور اس کے ہاتھ سے اس کے سربراہ کی تمام خوبیوں کے باوجود طاقت اور حکومت نکل جائے گی اور دوسرا گروہ اپنے سربراہ کے ظالم ہونے کے باوجود ترقی کریگا اور کامیاب ہوگا کیونکہ سنت الہی یہی ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے اور غالب آتا ہے جس میں باہمی اتحاد ہو جو اپنے سربراہ کا فرمانبردار ہو اور جو مخلص اور دیانتدار ہو۔

امام علیؑ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے اصحاب کو کسی دھوکے میں رکھیں یا ان سے غلط بیانی کریں کہ تم بے فکر رہو چونکہ تمہارے امام علیؑ ہیں، اس لیے تمہارے لیے دنیا میں کامیابی اور آخرت میں رستگاری ہے۔ اگر تم میں اتحاد و اتفاق نہیں تو کوئی بات نہیں، تمہارے امام امیرالمومنینؑ ہیں۔ اگر تم بددیانت ہو تو کوئی حرج نہیں، امام تو علیؑ ہیں۔ اگر تم اپنے امام کی اطاعت نہیں کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ امام علیؑ موجود ہیں۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے اپنا گھر اجاڑتے ہو تو کیا غم ہے جب تمہارے حاکم علیؑ ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری طرف چونکہ تمہارے دشمنوں کا سربراہ ایک ظالم شخص ہے، اس لیے کچھ بھی ہوا تمہیں ضرور شکست و ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا چاہے ان میں اتحاد و اتفاق تم سے زیادہ ہو، چاہے وہ تم سے زیادہ دیانتدار ہوں، چاہے تم سے زیادہ اپنے حاکم کے مطیع و فرمانبردار ہوں اور چاہے تم سے زیادہ اپنے اور اپنے ملک کے لیے مفید و سود مند ہوں۔ ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ اس قسم کی غلط بیانی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ

## قانونِ الہی پر امامِ علی کا خطبہ

امیر المومنین امام علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں جو پنج ایلاغہ میں موجود ہے، فرمایا تھا: میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے کیونکہ باطل پر ہونے کے باوجود ان میں اتفاق ہے اور وہ اپنے حاکم کے اطاعت گزار ہیں اور دل سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو۔ وہ اپنے علاقے کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں اور تم اپنے علاقے میں تباہی مچاتے ہو۔ اگر میں تم میں سے کسی کو نگرہی کا ایک پیالہ بھی سپرد کروں تو ڈرنا رہتا ہوں کہ میں کوئی اس کا دستہ ہی نہ اڑالے۔

امیر المومنینؑ نے ان کلمات میں انہی آیات کی تفسیر اور تشریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ قانونِ خداوندی اور سنتِ الہی سے سرتابی ممکن نہیں۔ وہ اپنے اصحاب سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم فقط اس وجہ سے کہ تمہارا امام علیؑ ہے غالب نہیں آسکتے اور دوسرے محض اس لیے مغلوب نہیں ہوں گے کہ انکا حاکم بُرا شخص ہے۔ غالب و مغلوب ہونے سے متعلقِ خدائی قانون یہ نہیں ہے کہ جس فریق کے ساتھ امامِ عادل ہو وہی غالب آجائے چاہے اس فریق میں انخاد و منقود ہو اور چاہے وہ اپنے امام کی نافرمانی کرتا ہو، امام کو دھوکا دیتا ہو اور خود اپنے علاقے میں تباہی پھیلاتا ہو۔ غرض وہ احد میں مسلمانوں کو اسی لیے شکست ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے رسولؐ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی حالانکہ یہ سب مسلمان، خدا، رسولؐ اور قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور انکے مقابلے میں خدا اور رسولؐ کے دشمن تھے۔ اسی طرح یہ بھی سنتِ الہی نہیں ہے کہ اگر کسی گروہ کا

یعنی یہ لوگ جو بت پرستی نہیں چھوڑتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اپنی چالوں سے اسلام کی ترقی میں مانع ہوں، کیا یہ بھی وہی سلوک چاہتے ہیں جو انکلوں کے ساتھ ہوا ہے کیونکہ سنتِ الہی تو بدلتی نہیں۔

سورہ مومن کی ۸۵ ویں آیت میں ہے کہ:

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي  
 قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ○

”سو ان کو اس وقت ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہی سنتِ الہی ہے جو اس کے بندوں میں چلی آ رہی ہے چنانچہ اس وقت کافر کھٹے میں رہ گئے“

یعنی جن لوگوں نے ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا جب ہم نے ان پر عذاب بھیجا تو وہ عذاب کی سختی سے گھبرا کر کہنے لگے کہ ہم ایمان لاتے ہیں لیکن چونکہ عذاب آنے کے بعد ایمان لانے تھے اس لیے انھیں اس ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہی سنتِ الہی ہے۔

ان تمام آیات کے مجموعے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدائے متعال کسی کی خاطر اپنی روش اور سنت نہیں بدلتا۔ نہ کسی کو بلاوجہ سرخرو کرتا ہے نہ بلاوجہ ذلیل۔ اس کی بھی وجہ ہوتی ہے اور اس کی بھی۔ خدائے کسی قوم کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہمیشہ پسماندہ اور نادار رہے۔ جنہیں دولتِ عزت اور سر بلندی ملی ہے وہ بھی قانونِ الہی کے تحت ٹلی ہے اور جن کے حصے میں ذلت و رسوائی آتی ہے وہ بھی قاعدے کے مطابق ہے۔

جو ان سے پہلے ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو کفر پر اڑے رہے۔

سورہ فتح کی ۲۳ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ:  
 وَلَوْ فَتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَكُلُّوا أَلْدَابَارًا ثُمَّ لَا يُجِدُونَ  
 وَبَيًّا وَلَا نَصِيرًا ○ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ  
 قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ○

”اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیچھے دکھا کر بھاگتے۔ پھر نہ ان کو کوئی  
 حامی ملتا نہ مددگار۔ وہی اللہ کا دستور (سنت) جو پہلے سے چلا آتا ہے  
 اور اللہ کے دستور میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

یعنی اگر مشرکین مکہ حدیبیہ میں جنگ کرتے تو انھیں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور  
 بھاگتے ہی بن پڑتی اور پھران کا کوئی یار و مددگار نہ ہوتا۔ پچھلے کافروں کے ساتھ  
 بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہی سنتِ الہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایمان  
 اور کفر کی آدیزش میں کامیابی ہمیشہ اہل ایمان ہی کا مقدر ہے۔

سورہ فاطر کی ۴۳ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:  
 وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۗ فَهَلْ يَنْظُرُونَ  
 إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۗ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۗ  
 وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ○

”بڑی تدبیروں کا وبال انہی پر پڑتا ہے جو یہ چاہیں چلتے ہیں۔ تو کیا  
 وہ اسی دستور کے منتظر ہیں جو انکوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے تم اس  
 سنتِ الہی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ ہی اس میں  
 کوئی تغیر پاؤ گے۔“



سورۃ بنی اسرائیل کی ۷۷ ویں آیت میں بھی یہی بات اس طرح دہرائی گئی ہے:  
 سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا  
 تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ○

”جیسا کہ ہمارا ان کے بارے میں دستور رہا ہے جن کو ہم نے تم سے  
 پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا اور تم ہمارے اس قاعدے میں کوئی تبدیلی  
 نہیں پاؤ گے“

سورۃ انفال کی ۳۸ ویں آیت میں بھی سنت کا لفظ انہی معنوں میں استعمال

ہوا ہے:

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ  
 سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ○

”ان کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ کفر سے باز آجائیں گے تو ان  
 کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے لیکن اگر کفر پر ہی ڈٹے رہیں  
 گے تو کفار سابقین کے حق میں ہمارا دستور (سنت) نافذ ہو چکا ہے“  
 یعنی ان کے بارے میں وہی پرانا قاعدہ جاری ہو گا جو ہمارا دستور ہے  
 اور جس طرح وہ لوگ ہلاک کیے گئے یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں گے۔

سورۃ حجر کی ۱۳ ویں آیت میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے:

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ○

”یہ ایمان نہیں لاتے۔ یہ دستور انگوں ہی سے ہوتا چلا آیا ہے“

یعنی کفار مکہ جو رسول خدا سے دشمنی اور عناد پر اڑے ہوئے ہیں اور ایمان  
 نہیں لاتے ہیں ان کا معاملہ واضح ہے۔ ہم ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے

ہیں یعنی خدائے متعال کا وہ طرز عمل جو گزشتہ قوموں کے ساتھ رہا ہے۔ ہر جگہ اللہ تعالیٰ یہی فرماتا ہے کہ میری سنت میں تغیر نہیں ہوتا۔ عزت و سربلندی کا ایک طریقہ ہے، میں اس کو نہیں بدلتا۔ بد سختی و بیچارگی کا بھی ایک راستہ ہے جو ناقابلِ تغیر ہے۔

سورۃ احزاب کی ۶۳ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ

لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ○

”ان لوگوں میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اللہ نے اپنا یہی دستور رکھا ہے اور تم خدا کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے“

مطلب یہ ہے کہ گنہگاروں اور منافقوں کے بارے میں اللہ کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اتمامِ حجت کے لیے پہلے پیغمبروں کو بھیجتا ہے اور حق و باطل کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں، خدا ان کو ہلاک اور نیست و نابود کر دیتا ہے اور جو لوگ خدا اور رسولؐ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، نفاق اور ریاکاری کا راستہ اختیار کرتے ہیں، خدا کے ساتھ بھی ہوتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے ساتھ بھی۔ رسولؐ کے ساتھ مل کر مالِ غنیمت میں حصہ بٹورتے ہیں اور دوسرے فائدے حاصل کرتے ہیں اور دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور فتنہ پھیلاتے ہیں، خدا ایسے لوگوں کو سزا کرتا ہے۔ ان کے لیے ہر طرف سے راستہ بند کر دیتا ہے۔ وہ نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت اور دستور ہے، اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ مکرو نفاق کسی دن رسوائی کا باعث ہو تو کسی دن سہ خرونی کا

بھی ہو اچھی ہے لیکن اتنی بات سے کوئی نیک نہیں بن جاتا اور نہ بُروں کے زمرے سے خارج ہو سکتا ہے۔ نیکوں میں شمار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی روش اختیار کی جائے۔ صرف اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ میں نیکوں کا طرفدار ہوں اور بدکاروں کا مخالف۔ قرآن مجید نے گزشتہ پیغمبروں کے قصوں اور اگلی قوموں کی سرگزشت کے بیان پر خاص توجہ دی ہے لیکن مقصد مسلمانوں کو فقط یہ بتانا نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ اچھے آدمی تھے اور فرعونؑ بُرا تھا یا قوم عاد و ثمود یسے راہ تھی اور فلان دوسری قوم راہِ راست پر تھی حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں یا نجران کے ان عیسائیوں کے اچھا ہونے سے جو شاہِ یمن و نواس کے ہاتھوں مارے گئے تھے یا ذونواس کے بُرا ہونے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ اور کیا نقصان؟

گزشتہ قوموں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ان عوامل پر غور کریں جن سے بعض قوموں کو عزت اور سرفرازی نصیب ہوئی اور بعض دوسری قوموں کے حصے میں ذلت و سوائی آئی اور ان باتوں پر عمل کریں جن سے قوموں کو سربلندی اور سرفرازی ملتی ہے اور ان سے بچیں جن کی وجہ سے بعض قومیں عذابِ الہی میں گرفتار ہو کر نابود ہو گئیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ خدا نے تم پر ذل و لایزال کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ اگر کوئی قوم کسی وجہ سے سرفراز ہوئی تو وہ وجہ ہمیشہ سرفرازی کا موجب ہوگی اور اگر کوئی قوم کسی سبب سے بدبختی کا شکار ہوئی تو وہ سبب ہمیشہ بدبختی ہی کا باعث ہوگا۔

**سنت الہی ناقابلِ تغیر ہے**

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی سنت کا لفظ آیا ہے اس کے معنی روش کے

اور ان کی بد فطرتی اور بد کاریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صالح اور سعادتمند افراد پر درود و سلام بھیجا ہے اور زبوں فطرت اور بد خصلت لوگوں پر نفرین کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ اسلام میں شہیدوں اور راہِ حق میں جان دینے والوں پر درود بھیجا اور ان لوگوں پر چھوٹوں نے ان بزرگوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور انھیں قتل کیا لعنت کرنا ایک مستحسن فعل اور اچھی بات ہے لیکن اتنی سی بات سے دین و دنیا کی بھلائی اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ فکر و عمل میں نیکیوں کا طریقہ اختیار کیا جائے اور برے لوگوں کے طریقوں سے اجتناب کیا جائے۔ ورنہ پھر وہی بات ہوگی جو فرمانِ خداوندی ہے کہ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ نیک اور فرشتہ خصلت بھی گزر گئے اور بد باطن و بد خصلت بھی۔ انھوں نے جو کچھ اچھے یا برے کام کیے اس کا بدلہ انھیں ہی ملے گا۔ نہ تمہیں نیکیوں کی نیکی کا اجر مل سکتا ہے نہ برے لوگوں کی بدی کے تم ذمہ دار ہو۔ اس آیت کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسے سورۃ بقرہ میں دس آیتوں سے بھی کم کے فرق سے ہرایا گیا ہے۔ کسی کو صرف یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحابِ عظیم انسان تھے اور ابنِ زیاد، یزید اور اس کے کارندے برے اور بد راہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتنے ہی لوگ زبان سے تو امام حسینؑ کی روحِ مقدسہ پر درود بھیجتے ہوں لیکن اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے لحاظ سے ابنِ زیاد کی پیروی کرتے ہوں۔ کتنے لوگ ہیں جو ماضی کے برے لوگوں پر تہقیر کرتے اور انھیں برا کہتے ہیں لیکن خود رفتار و کردار کے لحاظ سے انہی برے لوگوں کی روش اختیار کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ حق کی تائید اور اہلِ باطل کی مخالفت جس طرح

یہ آیت انہی الفاظ میں سورہ بقرہ میں دو جگہ آئی ہے۔ ایک جگہ آیت ۱۳۳ کے بعد جس کا مضمون یہ ہے کہ ”کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اسی خدا سے واحد کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیمؑ، اسمعیلؑ اور اسحاقؑ پرستش کرتے آئے ہیں“

اس کے بعد یہ آیت ہے کہ ”یہ ان بزرگوں کی ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا ان کے کام آئیگا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے کام آئیگا اور تم سے ان کے کیسے ہونے کا مول کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں ہوگی“

دوسری جگہ یہی آیت ۱۴۰ نمبر کی آیت کے بعد ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ”کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل یہودی یا نصرانی تھے؟ اے محمدؐ کہہ دیجیے کہ تم زیادہ واقف ہو یا اللہ؟ ان سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو ایسی شہادت کا انہماک کرے جو اسے خدا سے پہنچی ہو۔ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے“ اس کے بعد پھر وہی آیت ہے ”یہ ان بزرگوں کی ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کا کیا ہوا ان کے کام آئیگا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے کام آئیگا اور تم سے ان کے کیسے ہونے کا مول کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں ہوگی“

ہم نے اب تک واقعاتِ عاشورا کے ضمن میں متعدد نیک و لہجہ جان نثار اور مومن و متقی حضرات کا تذکرہ کیا ہے اور راہِ خدا میں ان کے عزم و استقلال، شجاعت و جرات و صبر و رضا اور اخلاقی بلندی پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح گنہگار و سرکش اور دغلو و منفتری لوگوں کے نام بھی لیے ہیں

میں تجھے بہت گھٹیا سمجھتی ہوں اور تجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تجھے سرزنش کروں۔ مگر کیا کروں، سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ تجھے سرزنش کرنے سے ہمارے شہید واپس نہیں آجائیں گے میرے بھائی حسینؑ قتل کر دیے گئے اب شیطان کے ساتھی ہمیں اس لیے احمقوں کے پاس لیے پھرتے ہیں تاکہ احکام خداوندی کی بے حرمتی کی تعیت وصول کر سکیں۔ انکے ہاتھوں سے ہمارا خون ٹپک رہا ہے اور ان کے منہ سے ہمارے گوشت کے ریزے جھڑ رہے ہیں۔ پاک شہیدوں کے لاشے بھیرٹیوں اور سیابانی درندوں کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے آج تجھے خون بہا کر کچھ فائدہ ہوا ہو لیکن کل یوم حساب تو گھٹا ہی گھٹا ہے۔ اس دن تو اعمال کا حساب دینا ہی ہوگا۔ اس دن تو اور تیرے کماتے آپس ہی میں لڑیں گے۔ اس دن تجھے معلوم ہوگا کہ تیرے باپ نے تیرے لیے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ تجھے فرزند ان رسولؐ کے قتل کا موقع فراہم کر دیا۔ بخدا میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی اور اس کے سوا کسی سے شکایت نہیں کرتی مگر تو خواہ کچھ بھی کرے یہ رسوائی کا داغ دھل نہیں سکتا۔“

دختر زہراؑ نے آخر میں خدا کا شکر ادا کیا اور کہا: ”شکر ہے اس خدا کا جس نے سردارانِ جنت کو بہشت بریں میں جگہ دی۔ وہ ان کے درجات اور بلند کرے اور اس کا فضل ان کے مزید شامل حال ہو۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے“

تاریخ کا کیا فائدہ ہے؟

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مِمَّا  
 كَسَبْتُمْ وَلَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا ہے کہ وہ انہیں اونٹوں پر بٹھا کر شہر بہ شہر لکھائیں  
ان کا کوئی دیکھنے اور پوچھنے والا تک نہیں۔“

اس کے بعد کہا: ”جو ہمارا دشمن ہے وہ ہم سے کینہ کیوں نہیں رکھے گا۔  
تو بڑی بیباکی سے کہتا ہے کہ کاش میرے بزرگ جو بدر میں قتل ہو گئے آج موجود  
ہوتے۔ تجھے خوف خدا نہیں، تو نے ابو عبد اللہ کے دانتوں پر چھڑی ماری۔  
ایسا کیوں نہ ہوتا۔ تو تو آل رسولؐ اور آل عبدالمطلب کے درخشاں ستاروں  
کا خون بہا کر پہلے ہی شرم و حیا سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ  
جلد ہی تجھے بھی خدا کے پاس جانا ہے۔ اس وقت تو تمنا کریگا کہ کاش تو اندھا  
اور بہرہ ہوتا اور یہ نہ کہتا کہ آج میرے بزرگوں کے لیے توشی کا دن ہے۔“

اس کے بعد نبوت رسولؐ نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ ”خدا یا جنھوں نے ہم  
پر ظلم کیا ہے تو ان سے ہمارا انتقام لے۔“ پھر یزید سے مخاطب ہو کر کہا:  
”اے یزید! تو نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قبر کھود لی ہے۔ تو جلد ہی  
رسولؐ خدا کے پاس جائے گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ فرزندِ رسولؐ  
بہشت بریں ہیں اور یہ خدا کا وعدہ ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ  
رَبِّهِمْ يُرِزُّونَ ۝ اور جو خدا کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ تصور نہ کرو۔ وہ

زندہ ہیں۔ انہیں خدا کے یہاں سے رزق ملتا ہے۔ یزید! جب خدا حاکم ہوگا  
اور حضرت محمدؐ منصف ہوں گے اس وقت تیرے باپ سے جس نے تجھے  
مسلمانوں پر مسلط کیا باز پرس ہوگی اور اس روز معلوم ہوگا کہ ظالموں کو کیا نزا  
ملتی ہے اور کس کا بڑا انجام ہوتا ہے۔ اے دشمنِ خدا! قسم ہے خدا کی

کے مطابق ایک دن آیاتِ خداوندی کی تکذیب کرنے لگے گا اور ان کا مذاق اڑانے لگے گا اور عذابِ جہنم کا مستحق ہوگا۔

اس کے بعد حضرت زینبؑ نے کہا: یزید! تو نے جو ہمارے لیے زمین و آسمان کے سب راستے بند کر دیے کہ آج ہم قیدیوں کی طرح ادھر سے ادھر ہنکاتے جا رہے ہیں تو کیا تو سمجھتا ہے کہ اس سے ہم کچھ ذلیل ہو گئے یا تجھے کچھ عزت مل گئی۔ تو نے جو دیکھا کہ تیرے حسبِ منشا کام ہو رہا ہے تو تو اکرٹنے ہی لگا۔ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ تو تجھے ڈھیل دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا أُنمِلُ لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمِلُّ لَهُمْ لِيَزِدُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ○ (سورۃ آل عمران آیت ۱۷۸)

کافروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے جو انھیں ڈھیل دی ہے اس میں کچھ ان کا فائدہ ہے۔ ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ ان کے گناہوں میں اور اضافہ ہو۔ بیشک ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

حضرت زینبؑ نے اس کے بعد یزید کو یاد دلایا کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر رسولِ خداؐ نے اہل مکہ پر احسان کر کے سب کو آزاد کر دیا تھا اور یزید ان ہی آزاد شدگان کی اولاد میں سے تھا۔ اس کے والدین اور اس کے دادا ابوسفیان آزاد شدگان ہی میں سے تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے ان کے سابقہ اعمال سے صرفِ نظر کر کے ان سب کو آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا جاؤ تم آزاد ہو۔ بنتِ رسولؐ نے اپنے حیلے کے دوسرے حصے میں اسی دن کی یاد کو موضوعِ سخن بنایا اور کہا:

”اے آزاد شدگان کی اولاد! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تو اپنی عورتوں اور کینڑوں کو تو پر دے میں رکھتا ہے اور بناتِ رسولؐ کی بے پردگی کرتا ہے انھیں



## دربارِ یزید میں حضرت زینب کا خطبہ

اب ہم زینب کبریٰؑ کی اس تقریر پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے یزید کے دربار میں کی تھی۔ یہ تقریر بلاغات النساء میں موجود ہے۔ ذکر اسی تقریر کا تھا درمیان میں تاریخ کی اہمیت کی بات آگئی۔

یزید نے عبداللہ بن زبیری سمی کے وہ کفر آمیز اشعار پڑھے جو اُس نے بحالت کفر کہے تھے۔ ساتھ ہی خود بھی ان میں کچھ اضافہ کیا اور صریحاً کہا کہ میں فرزدانِ محمدؐ سے اپنے آباء کا انتقام لینا چاہتا ہوں جو ایرانِ محمد کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ زینب بنت علیؑ انھیں، تقریر شروع کی اور یزید کی سہ سالہ خلافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

حضرت زینبؑ نے کہا کہ صَدَقَ اللهُ وَرَسُولُهُ يَا يَزِيدُ - شَمَّ  
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آسَأُوا وَالسُّوْأَى اَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللهِ وَ  
كَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ ○ اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے کہ جو بے  
کام کرتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو جھٹلانے لگتے ہیں  
اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں یعنی تو جو آج خدا کی نشانیوں کو جھٹلا رہا ہے اور  
ان کا استخفاف کرتا ہے اور جس طرح مکہ کے بت پرستوں نے جنگِ احد میں  
کچھ مسلمانوں کی شہادت سے خوش ہو کر کجیت گائے تھے، تو بھی فرزدانِ رسولؐ  
کی شہادت سے خوش ہو کر شعر خوانی کر رہا ہے اور رسولِ خداؐ سے انتقام کی  
باتیں کر رہا ہے، تو تیرا یہ حال کیوں ہے اور یہاں تک نوبت کیسے پہنچی؟ یہ  
سب تیرے اعمال کی شہادت ہے۔ جو شخص گناہوں پر اصرار کرے گا وہ قرآنی فیصلے

تو ہے، تیرا باپ ہے اور وہ ہے جس نے تجھے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا ہے اور اس کا باپ ہے۔ تم لوگ فرزندانِ پیغمبر کو قتل کرتے ہو اور پھر حق و صداقت کا نام لیتے ہو!۔“

حاضرین پر گویا بجلیاں گری گئیں۔ شہادتِ حسینؑ کا اعلان کیا کہ تھا کہ اس پر عبد اللہ کا دھماکہ خیز جواب اس سے بڑھ گیا۔ کہ بلا کی روح، ملوکیت کا چہرہ صحرا میں نونج آئی تھی۔ اب مسجد میں برسر عام اس پر تھپڑ لگا رہی تھی۔

ابن زیاد تو اس زعم میں تھا کہ تاریخ پر بھی اس کی حکومت ہے چنانچہ عبد اللہ کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور چلا کر کہا: اس کو پکڑ کر ہمارے پاس لاؤ۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ ان بزرگ نے جو کچھ کہا تھا، سوچ سمجھ کر کہا تھا اپنی جان پر کھیل کر کہا تھا۔ ابن زیاد کی تعوی بیانی کو درگزر کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ابن زیاد کے حکم سے انھیں سولی پر لٹکا دیا گیا مگر وہ تاریخ عاشورا کا ایک روشن باب اپنے خون سے لکھ چکے تھے۔

ابن زیاد نے امامؑ کے سر مقدس کو دیکھا تو ہنسنا۔ ہاتھ میں جو چھڑی تھی وہ امامؑ کے دندان مبارک پر مارنے لگا۔ زید بن ارقم ایک بوڑھے صحابی اس موقع پر دربار میں موجود تھے، انھوں نے جو دیکھا تو ابن زیاد سے کہا: اپنی چھڑی ان ہونٹوں سے ہٹا! خدا تے واحد کی قسم میں نے سینکڑوں بار رسول اللہؐ کو اپنے لب ان لبوں پر رکھتے دیکھا ہے۔ یہ کہا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

ابن زیاد شاید سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مسلمان بھی رہے اور فرزندِ رسولؐ کو قتل بھی کرے۔ مسلمان بھی ہو اور بنیانِ اسلام کو دروغلو بھی گردانے، اسلام کے پیاروں کا خون بھی بہائے اور تاریخ میں مسلمان بھی کہلائے۔

یزیدؑ امام کو قتل کر سکتا تھا، ان کے ہمراہیوں کو شہید کر سکتا تھا، اہلبیتؑ کو گرفتار کر سکتا تھا لیکن تاریخ کا چہرہ مسخ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ابن زیاد نے سانحہ کربلا کی باضابطہ اطلاع دینے کے لیے کوفہ کی جامع مسجد میں جا کر کئی ہزار کے مجمع سے خطاب کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا: اللہ کا شکر ہے کہ جس نے حق اور اہل حق کی مدد کی۔ امیر المؤمنین یزید ابن امیر معاویہ اور ان کے حامی کامیاب ہوئے اور کذاب ابن کذاب حسینؑ بن علیؑ اور ان کے ساتھی مالے گئے، ممکن تھا کہ اس تقریر سے لوگ کچھ مدت کے لیے شبہ میں پڑ جاتے اور خیال کرتے کہ حاکم وقت مسجد میں مسلمانوں کے عام اجتماع میں اس قدر زور دیکر جو کچھ کہ رہا ہے اس میں کچھ حقیقت ضرور ہوگی اور شاید بعض ناواقف اور کم اہم تو یہ سمجھتے کہ جب یہ اس واقعہ پر خدا کا شکر ادا کر رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بڑی خیر کی کہ حسینؑ مارے گئے۔ چلو اچھا ہی ہوا لیکن پیشتر اس کے کہ مجمع منتشر ہوتا ایک مسلمان نے اپنی جان پر کھیل کر ابن زیاد کی بکواس کا جواب دے ہی دیا۔ شیخ مفید اور طبری لکھتے ہیں کہ ابھی ابن زیاد کی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ عبداللہ بن عقیف ازوی غامدی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

یہ عبداللہ شیعیا بن علیؑ ہیں سے تھے۔ ایک آنکھ جمل میں کھوئی، دوسری صفین میں بستی برسوں سے یہ مسجد کے ہی ہو رہے تھے۔ سولے رکوع و سجد اور صلوٰۃ و درود کے کوئی کام بھاتا نہ تھا۔ ہر روز صبح کو مسجد میں آجاتے، دن بھر عبادت میں مشغول رہتے اور رات کو گھرواپس چلے جاتے۔

غرض ابن زیاد کی بد تمیزی جب حد سے تجاوز کر گئی تو ایک کونے سے سفید ریش عبداللہ نے ابن زیاد کو لاکارا اور کہا: ”اوپر سر جانہ! کذاب ابن کذاب“

ماہین ہوئی، وہ خطوط ہیں جو یزید نے ابن زیاد کو، ابن زیاد نے یزید اور عمر بن سعد کو، عمر بن سعد نے ابن زیاد کو اور ابن زیاد نے حاکم مدینہ کو لکھے۔ اس مواد کی مدد سے سانحہ عاشوراء سے متعلق ہر واقعہ کی پوری تفصیل بیان کی جاسکتی ہے اور کسی دوسرے مواد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جب یزید نے ابن زیاد کو خط لکھ کر عراقین (کوفہ و بصرہ) کا حاکم مقرر کیا تھا تو لکھا تھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ مسلم بن عقیل مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے کوفہ آئے ہیں۔ یہی با ابن زیاد نے اس وقت کہی جب حضرت مسلم کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابن زیاد نے سختی سے جھڑک کر کہا: ابن عقیل! اس شہر کے لوگ مطمئن اور خوش خرم تھے۔ تم نے آکر ان میں تفرقہ ڈال دیا اور انہیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ ابن زیاد نے یزید ہی کے الفاظ دہرائے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ حضرت مسلم نے جواب میں کہا: بات یہ نہیں ہے، نہ میں لوگوں میں پھوٹ ڈالنے اور اختلافات پیدا کرنے آیا ہوں اور نہ میں از خود آیا ہوں بلکہ یہاں کے باشندوں نے ہمیں خط لکھے تھے اور شکایت کی تھی کہ تیرے باپ زیاد نے ان پر ظلم کیا ہے اور بہت سے نیک لوگوں کو مروا دیا ہے۔ ہم انصاف قائم کرنے کے لیے آئے ہیں اور لوگوں کو قرآن کی تعلیمات پڑانے کی دعوت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ یزید اور ابن زیاد کے فخرے تو تاریخ میں درج ہوتے اور حضرت مسلم کا وہ مختصر جواب درج نہ ہوتا جس میں زیاد جیسے بدنام زمانہ ظالم کی حکومت کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید آنے والی نسلیں ہی خیال کرتیں کہ واقعی حضرت مسلم فتنہ جو اور شریک ہمسادی تھے اور یہ غیر ممکن تھا۔

پر ماری اور کچھ شعر پڑھے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کاش! میرے آباؤ اجداد جو بدر میں مارے گئے تھے آج زندہ ہوتے اور آل محمدؑ کی یہ حالت دیکھتے تو خوش ہوتے زینب کبریٰؑ اس پر کیسے خاموش رہ سکتی تھیں یہ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ جانشینی پیغمبرؐ کا بھی دعویدار تھا اور ساتھ ہی پیغمبرؐ سے انتقام بھی لینا چاہتا تھا۔ پیغمبرؐ نے جن مشرکین مکہ کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا وہ ان کی بجائے بزرگان اسلام کو قتل کر رہا تھا۔ ایسے شخص کے بالمقابل خاموشی کے یہ معنی تھے کہ اہل شام اس کی باتوں کو سنجیدگی سے لیں اور ان پر یقین کر لیں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ زینب کبریٰؑ اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتی تھیں انھوں نے جو کچھ کہا اپنا فرض سمجھ کر کہا اور حد نے بھی ان کی گفتگو کو محفوظ رکھا۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

### تاریخ بہت طاقتور ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ اہلبیت عصمت و طہارت کے خطبے اور تفسیریں دستبروزانہ سے محفوظ رہیں اور آج بھی معتبر کتابوں میں موجود ہیں خوش قسمتی سے واقعہ کربلا کی تاریخ سے متعلق نکلے مواد محفوظ ہے۔ اس میں وہ خطبے ہیں جو امام حسینؑ اور ان کے اہلبیتؑ نے مکہ میں، حجاز و عراق کے راستے میں کربلا میں، کوفہ میں، شام میں اور مدینہ میں دیے، وہ گفتگو ہے جو تفریق یوگوں کے استفسار کے جواب میں امامؑ اور اہلبیتؑ نے کی، وہ درج ہیں جو امامؑ اور آپ کے اصحاب نے دشمن کے مقابلے میں روزِ عاشور پڑھے۔ یہ سب معتبر کتابوں میں درج ہیں۔ اسی طرح وہ خط و کتابت ہے جو امامؑ اور اہل کوفہ و بصرہ کے

ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں خوب سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کہتے ہیں جو ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔

حضرت زینبؓ نے اس سوال کے جواب میں کہ دیکھا خدا نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کیا، کہا: 'خدا نے ان کے لیے شہادت مقدر کی تھی، وہ شہید ہو گئے۔ جلد ہی خدا تمہیں اور انہیں حساب کتاب کے لیے اکٹھا کرے گا تو اس کے سامنے جھک کر طے کا فیصلہ ہو گا'

ابن زیاد اس جواب سے اس قدر برا فروختہ ہوا کہ اگر عمر بن حربؓ سے سلامت نہ کرتا تو شاید وہ امام کی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا لیکن پھر بھی کیا ہوتا۔ حضرت زینبؓ نے تو اپنی بات کہہ ہی دی تھی اور یہ بھی بتلا دیا تھا کہ فاسق و فاجر کون ہے اور اہلبیتؑ کا کیا مقام ہے۔

ایک مہینہ اور گزرا تو اس سے بھی بڑی اور عام مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ضروری تھا کہ اور زیادہ واضح انداز میں اور دو ٹوک بات کی جائے۔ اہل شام، کوفہ والوں کی نسبت اہلبیتؑ سے زیادہ نا آشنا تھے اور زیادہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اس لیے بات کو اور زیادہ زور دیکر کہنے کی ضرورت تھی۔ یہ مجلس اس وقت کے مرکز خلافت یعنی دمشق میں تشکیل پائی تھی۔

یہاں بھی زینب کبریٰؓ نے خطبہ دیا اور گفتگو کی۔ اس خطبے کو بھی احمد بن ابی طاہر بغدادی متوفی ۲۸۵ھ نے اپنی کتاب بلاغات النساء میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب بربد کی نظر امیران اہلبیتؑ پر پڑی اور انہیں سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو حکم دیا کہ ایک طشت میں امام کا سر اس کے سامنے لایا جائے اور جو کھڑی اس کے ہاتھ میں تھی وہ امام کے نذران مبارک

جلو میں مجلس میں تشریف لائیں اور محل کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ ابن زیاد نے پوچھا کہ یہ جو عورت کون ہے؟ کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ دوبارہ پوچھنے پر حضرت زینبؓ کی ایک کینزنے کہا کہ یہ دختر رسولؐ حضرت فاطمہؓ کی بیٹی زینبؓ ہیں۔

اس موقع پر حضرت زینبؓ پر ایک بھاری ذمہ داری تھی۔ ضروری تھا کہ اول وہ خود ضبط سے کام لیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں اور دوسرے ابن زیاد کی بات کا جواب دیں اور اسے لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کرنے کا موقع نہ دیں۔

ابن زیاد نے کہا ”خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ذلیل کیا۔ تمہارے آدمی مارے گئے اور تمہارا نازہ جھوٹ کھل گیا۔“ ابن زیاد نے کامیابی کے نشے میں یہ کفر آمیز کلمات کہے۔ ورنہ بنی ہاشم نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کیا ان کا نازہ جھوٹ یہ تھا کہ وہ محمد رسول اللہؐ کہتے تھے یا کوئی اور جھوٹ تھا؟ بہر حال حضرت زینبؓ نے فوراً جواب دیا ”خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عزت بخشی اور ہمیں جس سے پاک رکھا۔ سوا فاسق ہوتا ہے اور جھوٹ فاجر بولتا ہے اور الحمد للہ کہ وہ ہم نہیں کوئی اور ہے۔“

دختر امیر المؤمنینؑ کا یہ دندان شکن جواب سن کر ابن زیاد بولا: ”دیکھا خدا نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کیا؟“ گویا وہ حضرت زینبؓ کی بہت سنی کرنا چاہتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ان کا حوصلہ پست کر کے انہیں اپنی خوشامد پر آمادہ کرے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اہلبیتؑ اپنے معاملے میں بہت ہوشیار

عورتوں کو قید ہونا ہی تھا اور اس بہانے سے بازاروں اور گزرگاہوں میں تقریباً کرنا اور دشمن کے پریسیکٹوے کا جواب دینا ہی تھا تو اس کام کے لیے دخترب امیر المؤمنینؑ سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا۔ انہوں نے جاں نثاری کا سبق رسولؐ خدا کی سب سے بڑی جاں نثار یعنی خدیجہ الکبریٰؓ اور آپ کے سب سے بڑے مہم درو حامی حضرت ابوطالبؓ سے میراث میں پایا تھا۔ زینب کبریٰ نے کوفہ کے بازار میں ایک خطبہ دیا اور بالکل اپنے والد محترم کی طرح داعشمن دی۔ معلوم ہوتا تھا زبانِ علیؑ سے بول رہی ہیں۔ ایک ہی اشارے میں لوگوں کو یوں خاموش کیا گیا سینوں میں سانس روک دیا۔

احمد بن ابی طاہر بغدادی متوفی ۲۸۰ھ نے اپنی کتاب بلاغات النساء میں اس خطبے سے متعلق تین روایات بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک کی سند امام جعفر صادقؑ تک پہنچتی ہے حضرت زینبؓ کی بہن ام کلثومؓ نے بھی کوفہ کے بازار میں خطبہ دیا۔ دونوں بہنوں نے اہل کوفہ کو خوب ملامت کی۔ لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور چہنچہ نکل پڑیں۔ حضرت فاطمہ بنتِ حسینؑ نے بھی کوفہ کے بازار میں خطبہ دیا اور لوگوں سے گفتگو کی اور انہیں ان کی غلطی اور بدقسمتی کی طرف توجہ دلائی۔

### حضرت زینبؓ کا این زیاد کو جواب

بازارِ کوفہ میں اہلبیتؑ کا کام مکمل ہو گیا تو انہیں ابن زیاد کی مجلس میں گفتگو کا موقع ملا۔ دختر امیر المؤمنینؑ نہایت سادہ لباس میں اپنی کینڑوں کے

لہ یہ ام کلثومؓ جنہیں ام کلثوم صغریٰ کہا جاتا تھا ان کی والدہ ام ولد تھیں۔



تاریخ عاشورا کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس طرح کی اور خواتین کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے کمالِ خلوص سے شہید کر بلا کی اس عظیم تحریک میں حصہ لیا اور حق کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ جہاں تک شہیدوں کی بات ہے وہ تو سب کے سب عالی رتبہ ہیں، چاہے ہاشمی ہوں یا غیر ہاشمی لیکن کوئی دوسرا اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو اس تحریک کے روحِ رواں امام حسینؑ کا ہے۔ اسی طرح ان خواتین میں سے جنہوں نے اس حادثہٴ فاجعہ میں اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا ہے کوئی بھی اس درجے تک نہیں پہنچ سکتی جو حضرت زینبؑ کے لیے مخصوص ہے۔ اسیری کے دوران میں انہوں نے اپنے بھائی کی جگہ لے لی تھی اور عصرِ عاشورا سے ورودِ مدینہ تک اسی پر وگرام کی تمکین کی تھی، جس پر امامؑ اپنی شہادت کے وقت تک عمل کر رہے تھے۔ امامؑ نے فرمایا تھا کہ دولت و بے بسی ہم اہلبیتؑ سے بہت دور ہے۔ حضرت زینبؑ نے اسی پر عمل کیا اور اس تربیت کا حق ادا کر دیا جو انہیں اپنی ماں سے ملی تھی۔ دختر امیر المؤمنینؑ سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ صبر و شکر سے کام لیں کیونکہ ان کی ماں حضرت فاطمہؑ اور نانی حضرت خدیجہؑ کا بھی یہی شیوہ تھا۔ حضرت خدیجہؑ اکبریؑ ہی تھیں جو سب سے پہلے رسولؐ خدا پر ایمان لائیں اور جنہوں نے دعوتِ اسلام کو آگے بڑھانے کے لیے تکلیف اٹھائی اور بعثت کے سالِ اول سے لیکر سالِ دہم یعنی اپنی وفات کے وقت تک ہر اڑھے وقت میں رسولؐ اللہ کی ہمد و غمگسار رہیں۔ زینبؑ کبریؑ انہی خدیجہؑ کی نو اس تھیں۔ امام حسینؑ نے جو قدم اٹھایا تھا اس کا مقصد ترویجِ دین اور اچانے دعوتِ رسولؐ کے سوا کچھ نہیں تھا لہذا اگر دینِ مبین اور قرآن مجید کی خاطر

امراء اقیس عیسائی تھے۔ زمانہ خلافتِ عمر میں خلیفہ کے پاس آکر اسلام لائے۔ اسی روز خلیفہ نے انھیں قبیلہٴ قضاہ کا امیر مقرر کر دیا۔ اسلام اور امارت کے بعد ان کی ایک اور عزت افزائی اس طرح ہوئی کہ ان کی تین بیٹیاں انھوں نے بڑی بیٹی کا نکاح امام علیؑ سے، منجھلی کا امام حسنؑ سے اور چھوٹی کا امام حسینؑ سے کر دیا اور اس طرح تین اماموں کے خسر ہو گئے۔ رباب سے امام حسینؑ کے ایک رط کی تھی سکینہ اور ایک رط کا تھا عبداللہؓ رط کا جو طفل شیرخوار تھا، روزِ عاشور شہید ہوا۔ یہ خود اپنی بیٹی سکینہ کے ساتھ قید میں چلی گئیں مگر خاص روزِ عاشور کے واقعات میں ان کا نام نہیں آیا۔

چوتھی وہ خاتون ہیں جن کا نام ان واقعات کے سلسلے میں لیا جاسکتا ہے جو روزِ عاشورِ نضر کے بعد پیش آئے۔ اس سانحہ کے صحیح حد و حال اُجاگر کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ یہ قبیلہ بکر بن وائل کی ایک خاتون تھیں۔ انھوں نے ایک مختصر بات کہہ کر تاریخ میں دشمن کی کمینگی کے ایک حساس رُخ کی تصویر کھینچ دی۔ ان کا شوہر ابن سعد کے شکر کے ساتھ آیا تھا۔ جس وقت انھوں نے دیکھا کہ کوفہ کے لشکر کی امام کی خیمہ گاہ میں گھس پڑے ہیں اور خواتین کے کپڑے تک لوٹ رہے ہیں تو انھوں نے باواز بلند کہا: اے آلِ بکر بن وائل! کیا تم زندہ ہو؟ دیکھو! یہ لوگ دشمنانِ رسولؐ کے خیمے وٹ رہے ہیں، آؤ اور خون کا بدلہ لو۔ اس خاتون نے یہ مختصر سی بات کہہ کر واضح کر دیا کہ دشمن کمینگی میں کہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ خاتون آج بھی ابو عبداللہ کی خیمہ گاہ کے دروازے پر فریاد کناں ہیں اور ان کی فریاد کی بازگشت قیامت تک گونجتی رہے گی۔

عبداللہ بن عمیر نے اجازت طلب کی اور تین تہا ان دونوں کا مقابلہ کر کے انہیں جہنم داخل کیا۔ عبداللہ کی زوجہ اپنے شوہر کی اس دلاوری کو دیکھ کر خود بھی حیمے کی ایک چوب لیے ہوئے میدان میں نکل آئیں اور اپنے عالی ہمت شوہر نامدار کو خطاب کر کے کہنے لگیں کہ میرے ماں باپ تم پر قربان رسول خدا کے فرزند ان پاک کے لیے جاں نثاری کا یہی وقت ہے۔ اس باہمت خاتون کے جوش اور حوصلے کو دیکھ کر امامؑ نے ان سے فرمایا: جزاک اللہ! مگر تم خواتین کے خیمے میں واپس جاؤ اور وہیں رہو۔ عورتوں پر جہاد نہیں ہے۔ عبداللہ دوسرے شخص تھے جو روزِ عاشور شہید ہوئے۔ شہیدِ اولِ مسلم بن عوسجہ تھے۔

ایک اور قابلِ فخر خاتون جن کا نام نامی واقعاتِ عاشوراء کے ضمن میں آیا ہے، امامؑ کی زوجہ محترمہ رباب بنتِ امرء القیس ہیں۔ امامؑ کی صرف یہی زوجہ سفر کر بلائیں ان کے ہمراہ تھیں۔ امام سجادؑ کی والدہ شہر بانو جو ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی تھیں، تقریباً چوبیس سال قبل وفات پا چکی تھیں۔ علی اکبرؑ کی والدہ یعلیٰ بنتِ ابی مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی کا نام بھی واقعاتِ کربلا کے ضمن میں کہیں نہیں آیا۔ معلوم نہیں یہ اس وقت زندہ تھیں یا نہیں۔ جعفر بن حسینؑ کی والدہ کا تعلق قبیلہ رضاء سے تھا۔ ان کا بھی ان واقعات کے سلسلے میں نام نہیں آیا۔ فاطمہ بنتِ حسینؑ کی والدہ اُمّ اسحاق بنتِ طلحہ بن عبید اللہ تھیں کا بھی تذکرہ نہیں، البتہ فاطمہ خود کربلا میں موجود تھیں اور کوفہ و شام بھی گئی تھیں۔ امامؑ کی ازواج میں سے صرف رباب بنتِ امرء القیس کبھی اس سفر میں امامؑ کے ہمراہ تھیں۔ انکے والد

تذکرہ سبط جوزی کے مطابق ایک اور فخر بھی اس خاتون کو حاصل ہے۔ جب زہیر شہید ہو گئے تو ان کی بیوی نے اپنے غلام سے کہا: ”جاؤ اپنے آقا کو کفن پہنا دو“ غلام آیا تو دیکھا امام کا لاشہ بے کفن ہے۔ اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے آقا کو کفن دوں اور امام کو ایسے ہی چھوڑ دوں چنانچہ پہلے اس نے امام کو کفن پہنایا اور پھر اپنے آقا زہیر کو۔

ایک اور خاتون جن کی شخصیت اور قربانی تحسین و آفرین کی مستحق ہے، عبداللہ بن عمر کلبی کی بیوی ام وہب ہیں۔ ان عبداللہ بن عمر کا تعلق نبی علم کی برادری سے تھا اور وہ کوفہ کے باشندے تھے۔ ایک دن دیکھا کہ ایک لشکر کوفہ کے قریب نجد میں صبح ہے۔ پوچھا کہ یہ لشکر کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ حسینؑ فرزندِ فاطمہؑ و خیر رسولؐ سے جنگ کے لیے عراق جا رہا ہے۔ عبداللہ نے کہا خدا جانتا ہے کہ میری آرزو تھی کہ راہِ خدا میں مشرکوں سے جنگ کروں۔ اب میرا خیال ہے کہ ان لوگوں سے لڑنا جو دخترِ زادۂ رسولؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے ہیں کچھ کم ثواب کی بات نہیں۔ عبداللہ نے روانگی کا عزم کر لیا تو اپنی بیوی ام وہب بنت عبداللہ سے تذکرہ کیا۔ بیوی نے کہا: تمہارا خیال بڑا ہی اچھا ہے۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ عبداللہ رات کے وقت کوفہ سے نکلے اور شاید آٹھویں محرم کو کربلا پہنچے۔ صبح عاشور جب جنگ کا آغاز ہوا تو دشمنوں کی طرف سے عبید اللہ بن زیاد کے دو غلام میدان میں آئے۔ ادھر سے حبیب بن مظاہر اسدی اور بریر بن خضیر ہمدانی ان کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوئے۔ امام نے ان دونوں سے فرمایا تم ٹھہرو۔ اس موقع پر

تاریخ میں قابلِ فخر مقام حاصل کر لیا۔ قسیدہ بنی فزارہ کا ایک شخص بیان کرتا ہے کہ ہم مکہ سے عراق آرہے تھے۔ امام حسینؑ بھی اسی راستے پر جا رہے تھے لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ کسی منزل پر ہمارا اور ان کا ساتھ ہو چنانچہ جب وہ کسی منزل سے روانہ ہوتے ہم پڑاؤ کر دیتے اور جب وہ کسی منزل پر اترتے تو ہم روانہ ہو جاتے لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک حیکہ ہمارا اور ان کا ساتھ ہو ہی گیا۔ ہم نے ایک کنارے پر خیمہ نصب کیا، انہوں نے دوسرے کنارے پر۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک امامؑ کا آدمی آیا۔ اس نے سلام کیا اور کہا: ذہیر بن یزیدؑ تمہیں ابو عبد اللہ بلارہے ہیں۔ یہ پیغام ہمیں برا بھی لگا اور اس پر حیرت بھی ہوئی لیکن ذہیر کی بیوی و نعم بنت عمرو نے ذہیر سے کہا: فرزندِ رسولؐ نے آدمی بھیجا ہے، تمہیں بلارہے ہیں۔ ضرور جاؤ، کوئی حرج نہیں، بات سن کر چلے آؤ۔ اس خاتون کی اس گفتگو نے اپنا اثر دکھایا۔ اس کے شوہر کا نام بزرگ ترین شہدائے اسلام کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ ذہیر بنی یزید کے کہنے پر امامؑ کی خدمت میں گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ آتے ہی کہا کہ میرا خیمہ بھی امامؑ کے کیمپ میں منتقل کر دیا جائے۔ بیشک:

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ

إِلَى النُّورِ ط (سورہ بقرہ آیت ۲۵۷)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم  
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم  
ذہیر امامؑ کے ہمراہ گئے اور شہادت کا شرف حاصل کیا۔ انکی بیوی  
اپنے عزیزوں کے پاس چلی گئیں۔

حساب کتاب میں غلطی نہیں کرتی اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرے کی گردن پر نہیں ڈالتی۔ بہت سے لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تاریخی حقائق پر پردہ ڈال دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ معاصرین کو حقیقت کے سمجھنے میں جو دقیقہ ہوتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں اور بعد میں آنے والے معاصرین کے مقابلے میں تاریخی حقائق سے بہتر واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ وقت تحقیق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ بے غرض محققین کے لیے تحقیق کی راہ آسان اور روشن بناتا ہے۔ آج ہمارے لیے واقعاتِ عاشورا کی تحقیق تیرہ سو سال پیشہ کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ہمارے سامنے وہ مشکلات نہیں جو ان لوگوں کے سامنے تھیں جو اٹھ سو سال میں موجود تھے اور آئندہ بھی کتنی ہی صدیاں بیتیں اور کتنے ہی جنگ پلٹیں اس واقعہ کی تحقیق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

### تحریر کی گرامی قدر خواتین

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تاریخِ عاشورا تہتر افراد کی بدولت وجود میں آئی۔ اس واقعہ کی سربراہی انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس قابلِ قدر اور زندہ جاوید کارنامے میں متعدد بزرگ خواتین نے بھی نمایاں حصہ لیا اور قربانی دی یہاں تک کہ بعض شہید بھی ہوئیں۔ ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ہم ان خواتین کے نام اور کام کا تذکرہ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ پہلی قابلِ صدا احترام خاتون زہیر بن قین بکلی کی اہلیہ ہیں جنہوں نے ایک مثبت اقدام کے ذریعے اسلامی

لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں کہ بیشتر لوگ ان خطبوں کے اس گمراہ اثر سے واقف نہیں تھے جو تاریخ پر مرتب ہونے والا تھا۔ جنہوں نے حضرت زینبؑ کا خطبہ دمشق میں سنا وہ عموماً یہی سوچتے تھے کہ ایک غمزہ خاتون شدتِ عم اور وفورِ جذبات سے ایسی باتیں کر رہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ جب کل اسکے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو وہ اس صدمے کو بھول جائیگی اور اسے آج کی باتوں کا دھیان بھی نہیں رہے گا۔ یہ کوناہ بین اس حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے کہ آج زینبؑ کی زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے، تاریخ کا طاقنورِ قلم اس کا ایک ایک لفظ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔ تاریخ کے قلم نے صرف وہی کچھ محفوظ نہیں کیا جو دخترِ امیرالمومنینؑ نے کہا تھا بلکہ ساتھ ہی حلیفہٴ وقت کے اشعار بھی محفوظ کر لیے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گئے۔

حیرت ہے کہ اگر دشمنانِ اہلبیتؑ کو خدا سے خوف اور رسولِ خدا سے حیا نہیں آتی تھی تو یہ خیال تو آنا چاہیے تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں یہ سب تاریخ میں لکھا جائے گا، کتابوں میں درج ہو گا اور دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ رہے گا۔ امام سجادؑ یا زینبؑ کی کسی خطبے کو نابود کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دنیا کے تمام کتب خانوں کو تباہ کر دیا جائے۔ تاریخ اگلوں اور پھلوں کا نامہٴ اعمال ہے تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص کا چہرہ جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا ہے۔ افراد فنا ہوتے رہتے ہیں، قومیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تاریخ اپنی جگہ قائم ہے اور کمال ہونے سے افراد کی نیکی یا بدی اور قوموں کے عروج و زوال کی نگرانی کرتی ہے تاریخ

وجود میں آیا اور سوگوار عورتوں اور بچوں نے اس کے خاکے میں رنگ بھرا۔ ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے کہ کس طرح اہلبیتؑ کے فصیح و بلیغ اور دلیر مقرروں نے لوگوں کے سینوں میں تلاطم برپا کر دیا۔ ان کے دل ہلا دیے، غلط فہمیوں کے پردے چاک کر دیے، لوگوں کی سوچ بدل دی، انہیں اس واقعہ کی قدر و قیمت کی جانب توجہ دلائی اور دشمن کے ہاتھ سے صورت واقعہ اور اس کی تاریخی حیثیت میں اول بدل کا موقع چھین لیا۔ دشمن کی بھی ہر تحریر و تقریر اور اس کی ہر بیہودگی اور کمینگی جزو تاریخ بن گئی۔ تاریخ میں جو واقعات عاشورا کی واضح اور صاف تصویر نظر آتی ہے اس کی اصل وجہ وہ خطبے ہیں جو امام حسینؑ نے مسجد الحرام میں، حجاز اور عراق کے راستے میں اور عاشورے کے دن دیے۔ دوسرے شہدائے عاشورا امام سجادؑ اور دیگر اسیراں اہلبیتؑ کے خطبوں نے اس تصویر کو مزید مکمل اور واضح کر دیا لیکن جب یہ زندہ جاوید خطبے دیے گئے تھے تو اس وقت بہت ہی کم لوگوں کا دھیان ان کی قدر و قیمت اور تاثیر کی طرف گیا ہوگا، صرف مقررین کو ہی پورا اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، کب کر رہے ہیں اور ان کی باتوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ جس طرح کہ خود امام حسینؑ کو اسی وقت سے جب وہ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے، معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں اور ان کی تحریک کا عالم اسلام پر کیا نتیجہ مرتب ہوگا! اسی طرح ان کے شیعیہ اور اسیراں اہلبیتؑ بھی علیؑ وجہ البصیرت جانتے تھے کہ کب اور کہاں بات کرنے کی ضرورت ہے اور پھر اسکے باوجود کہ ان کے دل سمجھے ہوئے تھے اور ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، خوب خوب داؤ سخن دیتے تھے، حقائق پر سے یوں پردہ اٹھاتے رہے کہ دشمنوں کیلئے تاریخ میں تحریف کی راہ بند کر دی۔



شب و روز خیال رکھو۔ یہ معلوم رکھو کہ فوجی چھاؤنیاں اور چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔ خدا ہی تمہیں پناہ دینے والا اور قوت بخشنے والا ہے۔ تمہیں اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے کیونکہ تمہارے لیے اسی کی مدد کافی ہے۔

یہ ایک عباسی خلیفہ کی نصائح کا نمونہ ہے۔ عبارت آرائی اور انشا پر داری کے لحاظ سے یہ نمونہ بہت قابل قدر اور موثر ہے لیکن پھر بھی اسلامی تاریخ میں دینی مواظب اور آسمانی حکمتوں کی صف میں جگہ نہیں لے سکا۔ بنی امیہ اور بنی عباس اپنی تمام دولت و طاقت کے باوجود اس قسم کے وصیت ناموں سے کوئی نفع ابلغانہ یا صحیفہ رسخا دیہ نہیں مرتب کر سکے اور نہ تحف العقول جیسی کوئی کتاب جو رسول خدا اور ائمہ اطہار کے مواظب کا مجموعہ ہے ترتیب دے سکے۔ تاریخ کو شخصیتوں اور ان کے کلام کو پرکھنے کی جو مخصوص قدرت و بصیرت حاصل ہے وہ اس کی بنا پر کچھ خطبوں، خطوط اور اقوال کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے اور بظاہر انہی جیسے دوسرے اقوال کو رد کر دیتی ہے۔ یہ کام تاریخ کا ہے جو وقت گزرنے کیساتھ انجام پاتا ہے۔ معاصرین عموماً حقیقت کا مکما حفہ اور اک نہیں کر سکتے۔

### تحریریک کر بلا کیوں ناقابل فراموش ہے؟

جب واقعہ کر بلا پیش آیا تو اس وقت بہت تھوڑی تعداد میں اہل بیتؑ اور شیعہ اہل بیتؑ تھے جو اس واقعہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے تھے یا تاریخ پر اس کے آئندہ مرتب ہونے والے اثرات پر گفتگو کر سکتے تھے اور ایک حد تک لوگوں کی غلط فہمیاں دور کر سکتے تھے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانحہ بہتر مردوں کے جان دینے سے

مانگا رہے ہوں گے۔

اس وقت تمہارا کوئی قریبی عزیز تمہاری حمایت نہیں کریگا۔ ہر عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کی سفارش قبول نہیں ہوگی۔ میزان عدل درمیان میں ہوگی۔ ہر فیصلہ ناطق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس روز کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور سب کا حساب جلد چکا دیا جائیگا۔ ضروری ہے کہ اس دن کے لیے ابھی سے تیار رہو اور اپنی نجات کے لیے کوشش کرو۔ اپنی گردن کو گناہوں کے پھندے سے چھڑاؤ۔ آج جو موقع ہے اسے غنیمت سمجھو اور کل آنے والی قیامت سے ہوشیار رہو۔ دنیا دھوکے باز ہے اس سے بچتے رہو۔ اپنی نیت کو درست رکھو اور ہر حاجت خدا ہی سے طلب کرو۔ ضروری ہے کہ تمہارا انصاف ہمہ گیر ہو۔ ہر ایک سے انصاف کرو۔ کسی پر ظلم نہ کرو اور رعایا میں سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرو۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ دیندار لوگوں میں سے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا انتخاب کرو۔ مسلمانوں کو ان کے مال میں سے جائز حصہ دو۔ خراج اور مالِ غنیمت میں سے ان کا حق ادا کرو۔ انکے وظائف اور تنخواہیں باقاعدگی سے اور بروقت دو۔ شہروں اور دیہاتوں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کر کے ان کی آباد کاری میں امداد کرو۔ اپنے حسن سلوک اور خوش تیاری سے لوگوں کی اصلاح کرو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کرو اور ان کی نگرانی رکھو۔ جہاں ضرورت ہو وہاں فوجی دستے بلا تاخیر روانہ کرو۔ جہاد اور دین کی حمایت میں کامیابی کی دعا اللہ تعالیٰ سے کرتے رہو۔ وہی مسلمانوں کو کامیابیوں اور کامرائیوں سے نوازتا ہے۔ اس کی راہ میں جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی سے دریغ مت کرو۔ اپنی فوج کا

وقت تمہارا خاندان تمہارے کسی کام نہیں آئے گا تم ہو گے اور تمہارے اعمال! اس وقت تمہارے اعمال تمہارے سامنے ہونگے۔ تمہارے اعصا تمہارے اعمال کی گواہی دیں گے چونکہ ہر نیکی اور بدی کی جزا اور سزا ملے گی اس لیے تمہیں چاہیے کہ تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور ہمہ تن خدا کی اطاعت میں مصروف رہو۔ خدا سے دیتداری کی توفیق مانگو اور دین کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کرو۔ اپنے نفس کا مواخذہ کرتے رہو اور اسے ہوا و ہوس کا کھلوانا نہ بننے دو۔ کسی برائی پر فساد مت کرو کیونکہ تمہارے اوپر بڑی ذمے داری ہے۔ تمہیں گناہ بھی اور اول سے زیادہ ہو گا اور جو اب بدی بھی زیادہ کرنا ہو گی چونکہ خدا نے تمہیں رعیت کا سرپرست بنایا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اس لیے تمہیں ہر ایک کو جواب دینا ہے۔ اپنے عمال اور کارگزاروں کے مظالم کی سزا بھی تمہیں ہی بھگتنا ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”تو بھی مرجائے گا اور دوسرے بھی مرجائیں گے اور پھر سب تیرے پروردگار کے سامنے جھکے گئے۔“ میں گویا دیکھ رہا ہوں کہ تم سے خدائے قہار کے سامنے سوال و جواب ہو رہا ہے۔ دوستوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے حامیوں نے تمہیں تمہاری قسمت کے حوالے کر دیا ہے تمہاری لغزشیں اور گناہ تمہارے کلو گیر ہیں۔ خوف سے تم پر لرزہ طاری ہے اور بے بسی سے تمہارے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ تم سب چوڑھی بھول گئے ہو۔ کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ لوگ تم سے اپنا حق مانگ لے رہے ہیں بدلہ لے رہے ہیں۔ اس دن کیا ہو گا جب ہر طرف خوف و ہراس طاری ہو گا اور آنکھیں خیرہ ہونگی۔ ظالموں کی نہ کوئی بات پرچھینے والا ہو گا نہ ساتھ دینے والا! لوگ تمہیں گھیرے ہوئے ہونگے اور اپنا حق

سمجھ بیٹھتے ہیں جو ذاتی اغراض کے اسیر اور حرص و ہوا کے بندے ہیں لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ لوگ چاہے غلطی کریں، تاریخ غلطی نہیں کرتی اور زمانہ گزرنے کے ساتھ غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اسی تاریخ نے امیر المومنین امام علیؑ کے مختصر فقروں کو بہترین مذہبی اور دینی نصیحتوں کا درجہ دیا ہے اور بہت سے دوسرے خلفاء کی بے روح طولانی تقریروں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم یہاں بطور نمونہ خلفائے بنی عباس میں سے منصور دوانیقی کی ان نصیحتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اس نے اپنے بیٹے ہمدی عباسی کے لیے لکھی تھیں۔ مشہور مؤرخ ابن واضح یعقوبی نے انھیں اس طرح نقل کیا ہے:

### منصور دوانیقی کا وصیت نامہ

یعقوبی کہتا ہے کہ منصور کے بیٹے ہمدی نے اپنے باپ ابو جعفر منصور کا وصیت نامہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا:

یہ وصیت ہے بندہ خدا امیر المومنین کی اپنے بیٹے محمدی ولی عہد کو جسے امیر المومنین نے اپنے بعد تمام مسلمانوں اور ذمیوں پر اور حرم اور بیت المال پر اپنا وصی اور جانشین مقرر کیا ہے۔ زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اچھا انجام پر بہتر کاروں ہی کا ہوگا۔ امیر المومنین تمہیں وصیت کرتے ہیں کہ جہاں بھی رہو تقویٰ کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور بندگانِ خدا کے بارے میں خدا کے احکام کی اطاعت کرو تا کہ روزِ محشر ندامت و پشیمانی اور رسوائی نہ ہو۔ جب موت آئے گی تو پھر نیکیوں کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس

واقعہ ہے کہ کنگلی و فرسودگی کبھی اس تک راہ نہ پاسکے گی۔ شاید اس وقت اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ جیت قاتلانِ حسینؑ کی ہوتی ہے اور صرف شہیدوں ہی کا قصہ نما نہیں ہوا بلکہ آئندہ بھی کسی کو سبھی امیر کی مخالفت کی حرات نہیں ہوگی اور آئندہ تاریخ اسلام میں امام علیؑ اور ان کی اولاد کا نام عزت و احترام سے نہیں لیا جائیگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ شہید کربلا اور ان کے اصحاب باوفا کی شہادت کا زخم بھر جائے گا اور دوسرے مصائب کی طرح یہ مصیبت بھی بھلا دی جائے گی لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہ لوگ غلطی پر تھے جو اس کے عاشورے کے واقعہ کو محض معمولی اور سیاسی معرکہ سمجھ رہے تھے۔ ان کی نظر میں مقصد کی اس بلندی تک نہیں پہنچ رہی تھیں جو امامؑ کے پیش نظر تھا اس لیے وہ واقعہ کی روح کو نہیں پاسکے تھے۔

جو مشکل اکثر لوگوں کی غلط فہمی کا باعث بنتی ہے، یہی ہے کہ لوگ ملتی جلتی باتوں اور کاموں میں تمیز نہیں کر سکتے چاہے ان میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ لوگوں نے اکثر دیکھا ہے کہ کوئی شخص حق کے نام پراٹھا، اس راہ میں قربانیاں بھی دیں لیکن انجام کار اس کے اقدام کا ذرا بھی اثر نہ ہوا یا بعض لوگوں نے مفاد نصیحت کے دریا بہا دیے۔ حق کی حمایت اور مظلوم کی طرفداری میں فصاحت و بلاغت کے جو ہر دکھائے، خوفِ خدا کی تلقین کی اور روزِ جزا سے ڈرایا۔ عذاب و ثواب کی باتیں کیں لیکن نہ لوگ پارسا ہوئے نہ تاریخ پر کوئی اثر مرتب ہوا۔ یہی دیکھ کر بسا اوقات لوگ مردانِ حق کی باتوں اور ان کے کاموں کو بھی خود غرضی پر محمول کرتے ہیں اور ان کی جدوجہد کے ربانی محرکوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے۔ وہ ان لوگوں کو جن کا ہر قول و عمل صرف خدا کے لیے ہے اسی جیسا

میں جمع کیے ہیں ان میں سے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے بارے میں ایک قول ہے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا:

«خَالِطُوا النَّاسَ مُخَالَطَةً إِنْ مِثْمُ مَعَهَا بَكَوْا عَلَيْنِكُمْ  
وَإِنْ عِشْتُمْ حَنُوا إِلَيْكُمْ»۔

یعنی لوگوں سے اس طرح پیش آؤ کہ اگر تم مر جاؤ تو وہ تم پر روئیں اور اگر زندہ رہو تو تمھاری طرف جھکیں۔

یعنی لوگوں کے ساتھ تمھارا سلوک ایسا ہونا چاہیے کہ تمھاری موت پر انھیں صدمہ ہو اور وہ آنسو بہائیں اور جب تک تم زندہ رہو تو تم پر فریفتہ رہیں مطلب یہ کہ آدمی حسن اخلاق سے لوگوں کے دل جیت سکتا ہے۔

صرف نیکی اور حسن سلوک ہی سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا جاسکتا ہے۔ امیر المومنینؑ کی اس نصیحت پر ان کے فرزند دلبند امام حسینؑ سے زیادہ کون ٹل پیرا ہو سکتا تھا اور آپ سے بڑھ کر کون اپنی زندگی میں اور اپنی شہادت کے بعد لوگوں کو اپنا والد و شہید ابن سکتا تھا؟

محرم ۱۰؍ میں سرزمین عراق پر دریائے فرات کے کنارے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں متعدد بزرگ اور مقدس ہستیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت بہت سے لوگ اسے ایک عام تاریخی حادثہ سمجھتے تھے اور شاید ان کا خیال تھا کہ تاریخ کے دوسرے سیکڑوں قدیم فرسودہ حوادث کی طرح یہ بھی چند سال میں تاریخ کی کتابوں کے کسی گوشے میں دفن ہو جائیگا اور اس کی وقعت ایک قصہ پارینہ سے زیادہ نہیں رہے گی لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ امام حسینؑ کی شخصیت زندہ و پابندہ ہے۔ انکی تحریک تاریخ عالم کا ایسا زبردہ جاوید

طریقے سے دولت کما رہے ہوتے ہیں۔ وہ ہر اس انقلاب کی مخالفت کرتے ہیں جس سے موجودہ صورت حال بدل جائے (پھر قیصر نے کہا کہ اس کے بعد میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ سچے مذہب کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا کوئی دین اسلام کو بُرا سمجھ کر چھوڑ بھی دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایمان کا یہی حال ہے۔ جب ایمان دل میں گھر کر لیتا ہے تو پھر آدمی اس سے کبھی بد دل نہیں ہوتا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا تمہارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی جنگ ہوئی ہے؟ تم نے کہا کہ ہاں ہوئی ہے اور کبھی تم غالب آئے ہو اور کبھی وہ۔ پیغمبرانِ خدا کا یہی حال ہے۔ کبھی کبھی انھیں تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے لیکن انجام کار فتح اور کامیابی انھیں ہی حاصل ہوتی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ تمہیں کن کاموں کا حکم دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ نماز پڑھنے، صدقہ دینے اور پارسائی، پاکدامنی، ایفائے عہد اور دیانتداری کا حکم دیتا ہے۔ تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ خود بھی مکار اور دھوکے باز نہیں ہے۔ پیغمبروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ وہ مکار اور دھوکے باز نہیں ہوتے۔ مجھے اس سوال و جواب سے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سچا پیغمبر ہے۔

یہ ایک مثال تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح دشمن بھی کس شخصیت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے اور حقائق میں پھیر بدل کی جرأت نہیں کر سکتا۔

**کلماتِ امیر المومنینؑ**

امیر المومنینؑ کے جو اقوال سید رضی رضوان اللہ علیہ نے تاج الہدایہ

ابوسفیان: کہتا ہے ایک خدا کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ  
 ٹھہراؤ۔ ہمیں بتوں کی پرستش سے (جو ہمارا آبائی طریقہ ہے)  
 منع کرتا ہے۔ کہتا ہے نماز پڑھو، صدقہ دو، سیح بولو،  
 پاکدامنی اختیار کرو، عہد و پیمان کی پابندی کرو، دیانتداری  
 سے کام لو۔

قیصر نے رسول اللہ کی شخصیت کے بارے میں اتنی ہی تحقیق کو کافی سمجھا  
 پھر ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے تم سے اس کے حسب نسب کے  
 بارے میں پوچھا تو تم نے اسے شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ شریف النسب  
 ہی ہوتے ہیں، میں نے تم سے پوچھا کہ کیا اس خاندان میں پہلے بھی کسی نے  
 نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ اگر تمہارے خاندان میں کسی  
 نے پہلے بھی دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ اسی کی تقلید کر رہا ہے۔ پھر میں نے  
 پوچھا کہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے یہ جھوٹ تو نہیں بولتا رہا ہے؟ تم نے  
 خود اعتراف کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے سمجھ لیا جو لوگوں سے جھوٹ  
 نہیں بولتا وہ خدا پر ہستان کیوں باندھے گا۔ میں نے پوچھا کہ اسکے آباؤ اجداد  
 میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ تم نے کہا نہیں۔ اگر اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ  
 ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ بھی بادشاہت کی ہوس میں اٹھا ہے۔ پھر میں نے  
 پوچھا کہ آیا اشرف اور طاقتور اس کے پیروکار ہیں یا کمزور اور غریب؟ تم نے  
 کہا کہ زیادہ تر غریب اور کمزور۔ پیغمبروں کے پیروکار ہمیشہ غریب ہی ہوا کرتے  
 ہیں (یعنی پیمانہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے) وہ لوگ جنہیں مستضعفین کہا  
 جاتا ہے، ان کے برخلاف جو لوگ موجودہ نظام کے تحت ہر جائز اور ناجائز



قبصر: سمجھ بوجھ میں کیسا ہے؟  
 البوسفیان: ہم نے اس کی سمجھ بوجھ میں کوئی نقص نہیں دیکھا۔  
 قبصر: جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں؟ اشراف  
 اور بااثر یا کمزور اور غریب؟  
 البوسفیان: غریب اور کمزور۔

قبصر: اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟  
 البوسفیان: روز بروز ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔  
 قبصر: کوئی اس کے دین سے پھر بھی جاتا ہے؟  
 البوسفیان: نہیں۔

قبصر: کبھی عہد شکنی اور قول و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟  
 البوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی۔ حال ہی میں ہم نے اس سے معاہدہ  
 کیا ہے معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا (معاہدہ صلح حدیبیہ مروجہ)  
 قبصر: کبھی تم نے اس سے جنگ بھی کی ہے؟  
 البوسفیان: ہاں کی ہے۔

قبصر: نتیجہ کیا رہا؟  
 البوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔ جنگ بدر میں اُسے  
 کامیابی ہوئی تھی لیکن میں اس موقع پر موجود نہیں تھا۔  
 ایک سال بعد (یعنی جنگ اُحد میں) ہم نے اس کے شہر  
 پر حملہ کیا اور پیٹے پھاڑ دیے اور ناک کاٹ دیے۔  
 قبصر: وہ کیا سکھاتا ہے اور کن کاموں کا حکم دیتا ہے؟

قبصر نے کہا: تمھاری محمدؐ سے کیا قرابت ہے؟  
 ابوسفیان نے جواب دیا کہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔  
 قبصر نے کہا نزدیک آ جاؤ!

اس کے بعد حکم دیا کہ ابوسفیان کے ہمراہی اس کی پشت کے پیچھے کھڑے  
 ہو جائیں۔ پھر اپنے مترجم سے کہا کہ ابوسفیان کے ساتھیوں کو بتاؤ کہ میں نے  
 اس آدمی کو تمھارے آگے اس لیے بٹھایا ہے کہ جب میں اس پیغمبرؐ کے بائے  
 میں پوچھوں اور اگر یہ جھوٹ بولے تو تم بغیر کسی جھجک کے اس کی تردید  
 کرو۔ ابوسفیان خود بعد میں کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ  
 میری تردید کریں گے تو میں ضرور جھوٹ بولتا لیکن شرمناک صورتی مجھے سچ  
 ہی بولنا پڑا۔

ذیل میں ہم قبصر اور ابوسفیان کا مکالمہ نقل کر رہے ہیں:  
 قبصر نے ابوسفیان سے پوچھا:

قبصر: اس مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟  
 ابوسفیان: اصل و نسل سے شریف ہے:

قبصر: اس سے پہلے تمھارے یہاں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟  
 ابوسفیان: نہیں۔

قبصر: دعویٰ نبوت سے پہلے جھوٹ بولتا تھا؟  
 ابوسفیان: نہیں۔

قبصر: اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟  
 ابوسفیان: نہیں۔

بھی اس سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔ سلسلہ کے اواخر اور سلسلہ کے اوائل میں رسول اللہ نے جزیرہ عرب کے قرب و جوار کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو خطوط ارسال کیے جن میں انھیں دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ جیسا کہ صاحب طبقات نے لکھا ہے آپ نے محرم ۶ھ میں چھ اپنی چھ خط دیکر بھیجے عمرو بن امیہ ضمری حبشہ کے نجاشی کے نام خط لیکر گئے۔ وحیہ بن خلیفہ کلبی مشرقی رومی سلطنت کے قیصر کے نام عبد اللہ بن حذافہ سہمی ایران کے خسرو پرویز کے نام حاطب بن ابی بلتعہ اسکندریہ مصر کے حکمران کے نام، شجاع بن وہب اسدی شام کے غسانی حکمران حارث بن ابی شمر کے نام اور سیط بن عمرو ہمامہ کے حکمران ہوزہ بن علی حنفی کے نام۔

### ابوسفیان کا عظمت پیغمبر کا اعتراف

جب وحیہ بن خلیفہ کلبی نے رسول اللہ کا مکتوب قیصر روم کو پہنچایا تو جیسا کہ انسان البیون، سیرہ نبویہ، تاریخ طبری اور کامل ابن اثیر میں لکھا ہے، قیصر کو تجسس ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ اہل حجاز میں سے کسی شخص کو میرے سامنے پیش کیا جائے تاکہ میں اس سے محمد کے بارے میں تحقیق کر سکوں۔ اس زمانے میں ابوسفیان اور قریش کی ایک جماعت تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے۔ انھیں بیت المقدس میں قیصر کے پاس لیجا گیا۔ وہ دربار میں حاضر ہوئے قیصر نے قریشیوں سے پوچھا کہ تم میں سے کون اس پیغمبر کا سب سے قریب راستہ دار ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ میں ہوں۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ اس قافلے میں ابوسفیان کے سوا اور کوئی نبی عہد منافی میں سے نہیں تھا۔

مقابلے میں تحریف سے محفوظ رہی ہے۔ یہ واقعہ اس قدر صاف، روشن اور غیر متوقع تھا کہ اس کے سامنے امام علیؑ اور امام حسنؑ کے مخالفوں کے سر بھی جھک گئے اور ان کی زبان سے بھی سولے تحسین و آفرین کے کچھ نہ نکلا۔ جس کسی نے بھی اس موضوع پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے، چاہے وہ مؤرخ طبری ہوں یا ابو الفرج اصفہانی، ابن واضح کا تب ہوں یا چوتھی صدی ہجری کے عالی قدر شیعہ رہنما شیخ مفید، سب ہی نے اس تحریک کے قائد کی عظمت و بزرگی، شجاعت و صاف گوئی، مردانگی و حریت، آزاد منشی و جواں مروی کی داد دی ہے۔ ۱۱۰ھ میں امام حسینؑ کی تحریک کچھ ایسے حالات میں انجام پائی کہ وہ لوگ بھی جو تاریخ میں تحریف سے ذرا نہیں بچکھاتے، تاریخ کے اس مقدس باب میں نہ کوئی پھیر بدل کر سکے نہ اس تحریک کو کوئی اور رنگ دے سکے۔ جو لوگ تاریخ میں تحریف کرنے یا کسی شخصیت کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ فقط اسی وقت اس کام کی جرأت کرتے ہیں جب ایسا کرنے کے لیے حالات سازگار ہوں ورنہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دشمنوں اور مخالفوں کو بھی کسی سستی کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اور پاکیزگی و پارسائی کی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے:

”وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ“

۱۱۰ھ میں ابو سفیان اموی کی دشمنی اس امر کی مقتضی تھی کہ قیصر روم کے سامنے رسول اللہ کی بدگوئی کرے، آپ کی امانت و دیانت کو چھپائے اور آپ کو دروغ گو اور جاہل پسند بتلائے لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع نہیں ملا اور اپنی مصلحت اور طبیعت کے رجحان کے برخلاف رسول اللہ کی تعریف ہی کرنی پڑی۔ اس نے جس طرح آپ کی عظمت کا اظہار کیا کوئی مسلمان

لکھا ہے کہ اہلبیت شام سے واپسی میں عراق و حجاز کے دورا ہے سے عراق کی طرف چلے گئے اور چہلم کے دن کربلا پہنچے لیکن اس کی کوئی تاریخی سند نہیں اور نہ جغرافیہ دا عراق و حجاز کے اس دورا ہے سے واقف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سید بن طاووس بہت بڑے بزرگ تھے۔ علامہ علی رضوان اللہ علیہ نے ان کے صاحب کرامات ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی جلالت قدر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ان کے بیان کردہ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کا قائل ہونا مشکل ہے۔ معلوم نہیں سید خود بھی اس ضعیف اور بے سند بات پر یقین رکھتے تھے یا نہیں!

بہر صورت یہ معاملہ تحقیق کا متقاضی ہے۔ یہ طرز فکر کہ ہر بات کو بلا تحقیق اور بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، حقیقت شناسی سے بعید ہے اگر سید بن طاووس ہمارے زمانے میں ہوتے، تب بھی ہم اس معاملہ خاص میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ تنہا ان کا قول اور وہ بھی ایک ایسی کتاب میں جو اہل تحقیق کے مطابق اہل حق نے اوائل جوانی میں تصنیف کی تھی، ہمارے لیے تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ محض عامیانہ سوچ ہے کہ ہر اس بات کو جو کسی نے کہی ہے یا کہیں لکھی ہوئی ہے، صحیح تصور کر لیا جائے۔ وہ لوگ جن کا قول سرسُومو غلط نہیں ہو سکتا عام مسلمانوں کے نزدیک صرف رسول اللہ اور اثنا عشری شیعہ مسلمانوں کے نزدیک حضرت رسول خدا، حضرت فاطمہ زہرا اور ائمہ اثنا عشری ہیں اور ان کی عصمت عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے۔

**تخریک کربلا تخریف سے محفوظ رہی**

یہاں ہمہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ عاشورہ دوسرے اکثر واقعات کے

اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دمشق میں کب تک قیام رہا اور وہاں سے روانگی کب ہوئی اور کس تاریخ کو مدینہ پہنچے۔ اگر کوئی قابل اعتماد سند ایسی ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اہل بیت امام کے چہلم کے موقع پر کربلا میں تھے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ شام جاتے ہوئے پیش آیا نہ کہ شام سے واپسی میں۔ اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اہلبیت وسط صفر سے دو تین دن بعد شام بھجھے جانے کا حکم موصول ہونے پر شام کے لیے روانہ ہوئے تو یہ کچھ بعید نہیں کہ وہ کربلا کے راستے سے گزرے ہوں اور ۲۰ صفر کو وہاں موجود ہوں اور اپنے عزیزوں اور شہیدوں کی زیارت کے بعد دمشق کے لیے روانہ ہوئے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ اس کی کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں۔ تاریخ کے جسٹہ جسٹہ مقامات سے کچھ شواہد البتہ ڈھونڈ کر نکالے جاسکتے ہیں لیکن اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں کہ شام سے واپسی پر اہلبیت چہلم کے دن کربلا آئے ہوں۔ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا یقین کیا جاسکے۔ مناسب یہی ہے کہ ایام عاشورا یا ربیعین کی مجالس میں اس قسم کی باتوں کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے اور انہی باتوں پر اکتفا کیا جائے جن کا معتبر ماخذ میں تذکرہ ہے۔ نہ امام سجاد شام سے عراق آئے، نہ اہلبیت عصمت واپسی میں کربلا پہنچے اور نہ جابر بن عبد اللہ انصاری اور عطیہ بن سعد بن جنادہ عمونی نے جب وہ ربیعین کے دن زیارت کے لیے آئے تھے، امام چہارم اور اہلبیت سے ملاقات کی۔ جو روایات جابر و عطیہ کی زیارت کے بارے میں ہیں ان میں امام سجاد یا اہلبیت سے ان دونوں بزرگوں کی ملاقات قطعاً مذکور نہیں۔ یہ کہانی صرف قصہ گو حضرات کی ساختہ وپرداختہ ہے۔ صرف سید بن طاووس رضوان اللہ علیہ نے

امام حسینؑ نے مدینہ سے مکہ روانگی کا قصد کیا اور ان کی انتہا اہلبیت عصمت و طہارت کی مدینہ واپسی کو سمجھنا چاہیے۔ اہلبیتؑ کی مدینہ واپسی کی قطعی تاریخ کا علم نہیں اور نہ یہ صحیح طور پر معلوم ہے کہ اہلبیتؑ نے دمشق میں کتنے عیسے قیام کیا اور کتنی مدت میں شام سے مدینہ کا سفر طے کیا لیکن اجمالاً یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ابھی ماہِ رجب میں ان کی مدینہ سے روانگی کو ایک سال نہیں ہوا تھا کہ امام سجادؑ قید میں ایک مدت گزارنے کے بعد اپنے اہل خاندان کے ساتھ دمشق سے براہِ راست مدینہ واپس تشریف لاتے۔

لیکن یہ کہانی کہ اہلبیتؑ شام سے عراق آئے اور حپلم کے دن یعنی ۲۰ صفر کو کربلا پہنچے، کسی طرح بھی قابل یقین نہیں اور نہ اس کی کوئی قابل اعتماد تاریخ سند ہے۔ اہلبیتؑ رجب ۳۰ھ میں مدینہ سے مکہ گئے اور اسی سال ماہِ ذی الحجہ میں عراق کے لیے روانہ ہو گئے۔ محرم ۳۰ھ میں امامؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے بعد بطور قیدی کوفہ لے جائے گئے۔ وہاں شام سے حکم آیا کہ انھیں دمشق بھیج دیا جائے۔ اس کے کچھ مدت بعد — یہ معلوم نہیں کہ کتنی مدت بعد — مدینہ واپس آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلبیتؑ کی کوفہ سے شام روانگی — دمشق میں آمد وہاں قیام — وہاں سے مدینہ روانگی اور اس مقدس شہر میں آمد ان میں سے کسی کی بھی صحیح تاریخ معلوم نہیں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس کس تاریخ کو یہ واقعات پیش آئے۔ ہاں قرآن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲ محرم ۳۰ھ کو کوفہ پہنچے اور تقریباً ایک ماہ یعنی وسط صفر سے کچھ بعد تک وہاں قید رہے اور شاید حپلم سے ایک دو روز پیشتر انھیں شام روانہ کیا گیا اور جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ربیع الاول کے وسط میں دمشق پہنچے۔

اہلبیتؑ سے چھین کر اپنے نام منتقل کر لے پھر ہم سے الجھے ورنہ جب تک یہ اعزازات ہمارے پاس ہیں کوئی ہمیں بدنام کیسے کر سکتا ہے؟ گناہ کیسے کر سکتا ہے اور ہمارا حق غیروں کو کیسے مل سکتا ہے؟ جو دل ہمارے ساتھ ہیں وہ کسی دوسرے کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد امام نے اپنا تعارف کرایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجبور ہو کر امامؑ کی تقریر کو روکنے کے لیے اذان دلوادی گئی۔ امامؑ کو بھی ناچار سکوت کرنا پڑا لیکن انہوں نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا۔ جب مؤذن نے کہا "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ"۔ آپ نے اپنا عامہ سر سے تار بیاہ اور کہا اے مؤذن! تجھے محمدؐ کی قسم ڈرا چہ پارہ۔ پھر بیدار کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بزدلیا یہ محمدؐ تیرے نانا ہیں یا ہمارے؟ اگر تو اپنے نانا بتائے گا تو جھوٹ بولے گا۔ اگر تو مانتا ہے کہ ہمارے نانا ہیں تو پھر تو نے میرے باپ کو کیوں قتل کیا؟ ان کا مال و اسباب کیوں لوٹا؟ ان کے اہل حرم کو کیوں قیدی بنا یا؟ یہ کہہ کر آپ نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ سننے والوں کے سینوں میں پھل جج گئی اور افراتفری کے عالم میں مجمع منتشر ہو گیا۔

### اہل بیت کا سفر کوہ و شام

امام حسینؑ کی مقدس تحریک اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ یہ ایک سال سے بھی کم مدت بظاہر مختصر تھی لیکن اس دوران میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے بڑے گہرے اور لازوال اثرات چھوڑے۔ ان واقعات کی ابتدا اس وقت سے قرار دی جا سکتی ہے جب رجبِ شہدہ کے اواخر میں



ہوں یعنی اس خطیب کی باتوں کا سننا سولے گناہ و بدبختی کے اور کچھ نہیں اور اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ لوگ دینِ حق سے منحرف ہو جائیں۔ بہر حال لوگوں نے اصرار کیا کہ علیؑ بن الحسینؑ کو بولنے کی اجازت دیدی جائے۔ یزید انکار کرتا رہا۔ پھر لولا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ علم و دانش ان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ اگر ان کو بولنے کی اجازت دی گئی تو میں رسوا ہو جاؤں گا۔ آخر لوگوں کے اصرار نے اپنا کام کیا۔ امام عالی مقامؑ نے منبر پر قدم رکھا اور اس طرح تقریر کی کہ سننے والوں کے دل لرز اُٹھے، آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور چینیں نکل گئیں۔ آپ نے اپنے خطاب میں اسلامی نظام میں اہلبیتؑ کی اہمیت کو واضح کیا اور فرمایا: اے لوگو! حق تعالیٰ نے ہمیں چھ نعمتوں سے نوازا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں ہماری برتری کے بنیادی ستون سات ہیں۔ وہ چھ نعمتیں جو ہمیں عطا ہوئی ہیں یہ ہیں: (۱) علم (۲) علم (۳) جو دو کرم (۴) فصاحت (۵) شجاعت اور (۶) مومنین کی قلبی محبت یعنی لوگوں کو زور اور زبردستی سے عقیدہ تمند و طرفدار نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ خدا ہی کی مرضی ہے کہ مومنین ہم سے محبت کریں۔ کوئی ان کے دلوں کو پھیر نہیں سکتا اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی غیر سے محبت کرنے لگیں اور ہم سے دشمنی رکھیں۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ دوسروں پر ہمارے تفوق کے بنیادی ستون سات ہیں۔ رسول اللہؐ ہم میں سے ہیں۔ آپ کے وصی علی بن ابی طالبؑ ہم میں سے ہیں۔ سید الشہداء حضرت حمزہؓ ہم میں سے ہیں۔ جعفر طیارؓ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے سبطین حسنؑ اور حسینؑ ہم میں سے ہیں۔ اس امت کے ہمدی اور قائم ہم میں سے ہیں یعنی اگر ہو سکے تو یزید ان اعتراضات کو

جانشین رسولؐ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسیرانِ اہلبیتؑ میں سے جس نے بھی  
یزید کو پکارا اس کا نام لیکر ہی پکارا۔

### دشوق کی مسجد میں امام سجادؑ کا خطبہ

امام عالی مقامؑ کو شام میں بہترین موقع اس دن ملا جب سرکاری خطیب  
نے منبر پر امیر المؤمنین علیؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں بدگویی کی اور  
معاویہ اور ان کے فرزندوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔  
امام سجادؑ نے یزید سے کہا کہ مجھے بھی اجازت دے کہ میں بھی ان لکڑیوں پر کھڑا  
ہو کر کچھ کہوں جس سے خدا بھی خوش ہو اور سامعین کے لیے بھی اجر و ثواب  
کا باعث ہو۔ اس مختصر فقرے میں بھی امامؑ نے بڑی عمدہ بات کہی۔ یوں  
کہنا چاہیے کہ امامؑ نے اپنی ساری گفتگو کا خلاصہ اس فقرے میں سمودیا۔ اول  
تو آپ نے منبر کو لکڑیوں سے تعبیر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہر اس چیز کو جسے منبر کی شکل  
دیکر تقریر کے لیے رکھ دیا جائے منبر نہیں کہا جاسکتا۔ دراصل منبر کی عظمت تو  
اس پر کھڑی ہونے والی ہستی کے دم سے ہوتی ہے۔ یہ لکڑیاں تو منبروں کا وجود  
مٹانے کے لیے رکھی گئی ہیں۔ یہ خطیب دنیا کے عوض دین فروخت کر رہا ہے  
کیونکہ یہ مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خالق کو ناراض کر رہا ہے۔ اس کا ٹھکانہ جہنم  
ہی ہوگا۔ اس کے بعد امامؑ نے کہا کہ میں کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جس سے  
خدا خوش ہو یعنی یہ خطیب جو کچھ کہہ رہا ہے، خدا کی ناراضگی کا سبب ہے۔ امام  
علی بن ابی طالبؑ جیسی ہستی کی بدگویی سے اللہ کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ آپ  
نے کہا کہ میں کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا ہوں جو سامعین کے لیے موجب اجر و ثواب

پڑھی ہے؟ اس نے کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا بخدا رسول کے قرابتدار ہمیں تو ہیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ امام سجادؑ نے اسی ایک سوال سے اس کے ضمیر میں لہجہ پیدا کر دی ہوگی۔ پھر آپ نے پوچھا تم نے قرآن میں آیت "وَآيَةٌ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقُّهُ" نہیں پڑھی جس میں ذوی القربی کا حق ادا کرنے کو کہا گیا ہے؟ کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ اس آیت کے مصداق بھی ہمیں ہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تم نے آیہ تطہیر "ثُمَّ لْيُرِيدَ اللَّهُ لِيَكْذِيبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" پڑھی ہے؟ اس نے کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا: ہمیں تو اہلبیت رسولؐ ہیں جن کی عصمت و طہارت کی گواہی خدا نے دی ہے۔ شامی نے امامؑ کی یہ بصیرت افروز گفتگو سنکر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور تین مرتبہ کہا: یا الہی میری توبہ! میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں میں دشمنان آل محمدؐ اور قاتلان اہلبیتؑ سے بیزار ہوں۔ یہ کیسی بات ہے کہ میں قرآن پڑھتا تھا مگر کبھی ان آیات کی طرف توجہ نہیں کی۔

امام چہارم کو ایک اور موقع اس وقت ملا جب یزید کے دربار میں اہلبیتؑ کو پہلی بار پیش کیا گیا۔ امام عالی مقام جو کوفہ سے اب تک بستہ زنجیر تھے، یوں گویا موتے۔ یزید! تجھے خدا کی قسم! تیرا کیا خیال ہے، اگر رسولؐ خدا ہمیں اس حال میں دکھیں تو کیا کہیں؟ یہ جملہ بڑا اثر انگیز تھا۔ اسی پر یزید نے زنجیر کھلا دی اور اسی کے اثر سے سب حاضرین مجلس رونے لگے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ امامؑ نے یزید کو نام لیکر مخاطب کیا اور دستور کے مطابق امیر المؤمنین نہیں کہا۔ تاریخ میں یہ بات بھی درج ہوگئی کہ اہل بیتؑ زنجیروں میں جکڑے ہوئے پر بھی یزید کو امیر المؤمنین نہیں کہتے اور نہ اس کی خلافت اور اس کے

اور اہل بیت کے بے مثال تدبر کے قابل ہو جائیں گے۔

امام سجادؑ کو ایک اور موقع اس وقت ملا جب اہل بیتؑ کو دمشق کی مسجد کے دروازے پر لپکا کر کھڑا کر دیا گیا۔ قیدی عموماً وہیں رکھے جاتے تھے۔ ایک شامی بڑھا وہاں پہنچا اور کہنے لگا: ”الْحَمْدُ لِلَّهِ قَتَلَكُمْ وَ أَهْلَكُمْ وَقَطَعَ قُرُونِ الْفِئْتَنَةِ“ اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگ مارے گئے۔ خدا نے فتنہ پردازوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد دیر تک اہل بیتؑ کو برا بھلا کہنا اور گالیاں دیتا رہا۔ امامؑ خاموش رہے اور اسے بکنے دیا۔ جب وہ بک چھک چکا تو امامؑ نے اسے مخاطب کر کے اس کی اس بات کا جواب دیا۔ امامؑ نے اُسے برا نہیں کہا، کوئی نامناسب بات نہیں کہی، نہ اس سے شکایت کی کہ تو نے ہمیں گالیاں کیوں دیں؟

امام سجادؑ اس موقع پر بیمار بھی تھے اور مسافر بھی، کوفہ سے دمشق تک کے راستے کا تعب بھی تھا اور نکلنے بھی، یوں بھی عمر زدہ اور مصیبت زدہ تھے۔ پھر ایک ایسے شہر میں آئے تھے جو دشمن کا مرکز تھا اور جہاں کے دروہو اور اہلبیتؑ عصمت کے مخالف تھے۔ اس شامی بڑھے نے گالیاں بھی دی تھیں۔ برا بھی کہا تھا اور اہلبیتؑ پر جو مصیبت پڑی تھی اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا اور خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا۔ کون ہے جو ایسے میں جھنجھلا نہ اُٹھے اور ایسٹ کا جواب پتھر سے نہ دے۔ کوئی بھی ان حالات میں ضبط نہیں کر سکتا مگر امامؑ نے ایک مہربان و ہمدرد معلم کی طرح اور اس طرح گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی، اس سے پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا۔ کیوں؟ فرمایا آیتِ مودتِ عَلَّ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْوُدَّ فِي الْقُرْبَىٰ

غرض شام میں بھی امام کو کئی مواقع ملے اور ہر موقع سے آپ نے حتی الامکان فائدہ اٹھایا۔ آپ قید میں تھے کہ دمشق کے بازار میں ابراہیم بن طلحہ بن عبید اللہ تیمی سامنے آیا اور چڑانے کے لیے امام سجادؑ سے کہا: کہو علیٰ بن الحسین! اس معرکے میں فتح کس کی ہوئی؟ مطلب یہ کہ اچھا ہوا کہ تمہیں شکست ہوئی اور تمہارے دشمن کامیاب ہوئے۔ امام نے کہا ابھی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اذان دو اور اقامت کہو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ حبیبت کس کی ہوئی یعنی تو چونکہ قریش کے خاندانِ تیم سے ہے اس لیے شاید ہاشم کی شکست سے خوش ہے لیکن جب تک تو مسلمان ہے تجھے اذان و اقامت میں "أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللَّهِ" کہنا ہی پڑے گا۔ ہم اسی محمدؐ کے فرزند اور وارث ہیں جن پر درود بھیجے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ جب تک اسلام قائم ہے ہم آلِ محمد کا یہ فخر بھی برقرار ہے گا۔ یہ چھوٹا سا جملہ امام نے ایک شخص کے جواب میں کہا اور شاید آہستہ سے کہا لیکن تاریخ میں آج تک اسکی گونج سنائی دے رہی ہے بعض دفعہ ایک ہی جملہ ان گنت مقالوں، کتابوں اور تقریروں کے وجود میں آنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس وقت ان باتوں کا حساب نہ ابراہیم رگا سکتا تھا نہ طلحہ نہ کوئی اور۔ اس وقت کسے ہوش تھا کہ مختصر جملے کی کمیت سے قطع نظر کر کے اس کی کیفیت کی طرف توجہ کرے لیکن امامؑ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چھوٹا سا جملہ کہنے کے لیے شام آئے ہیں۔ انہوں نے اس سفر میں اس چھوٹے سے جملے کے سوا کچھ نہیں کہا جو مقصد ان کے پیش نظر تھا اس کے حصول کے لیے یہی جملہ کافی تھا۔ جو لوگ آج بھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے، وہ بھی مستقبلِ قریب میں امام حسینؑ ان کے اصحاب

جواب میں قرآن کی یہ آیت پڑھی: **اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا**  
 یعنی اللہ جانوں کو لے لیتا ہے جب ان کی موت آتی ہے لیکن قاتل خدا  
 نہیں ہو سکتا۔ ابن زیاد یہ دیکھ کر کہ ایک بیمار قیدی بار بار الٹ کر اسکی بات کا جواب  
 دے رہا ہے غصے میں لال سیلا ہو گیا اور کہنے لگا اب بھی تجھ میں اتنی ہمت  
 ہے کہ میرے سامنے زبان چلائے؟ لیجاؤ اسے اسکی گردن مار دو۔

زینب کبریٰؑ تو یزید غرہ سن کر بہت پریشان ہو گئیں لیکن امامؑ نے ابن زیاد  
 سے صرف اتنا کہا کہ تو مجھے مار ڈالے گا تو ان پاکباز خواتین کو کس کے ساتھ بھیجے  
 گا۔ پھر فرمایا کہ کسی پرہیزگار مسلمان کو ان کے ساتھ بھیجنا جو اسلامی آداب  
 کے مطابق ان سے برتاؤ کرے۔

امام زین العابدینؑ نے اپنی جاں بخشی کی قطعاً کوئی درخواست نہیں کی  
 بلکہ یہ فرمایا کہ میرے قتل کے بعد ان پاکباز خواتین کو ایسے لوگوں کے ہمراہ مدینہ  
 نہ بھیجنا جو متقی نہ ہوں۔

یہ لہو ف سید میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہے کہ جب ابن زیاد نے علی بن الحسینؑ  
 کے قتل کا حکم دیا تو زینب کبریٰؑ نے فرمایا: **يَا ابْنَ زِيَادٍ إِنَّكَ لَمُرْتَبِقٌ مِّثْلَ أَحَدًا**  
**فَإِنْ كُنْتَ عَزَمْتَ عَلَى قَتْلِهِ فَأَقْتُلْنِي مَعَهُ** ابن زیاد اگر تو نے  
 ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہی قتل کر دے۔

امامؑ نے فرمایا: پھوپھی جان! آپ نہ گھبرائیے۔ میں خود اسے جواب دوں گا۔ پھر  
 ابن زیاد کو مخاطب کر کے کہا: **أَبَا الْقَتْلِ تَهْدِدُنِي يَا ابْنَ زِيَادٍ أَمَا عَلِمْتَ**  
**أَنَّ الْقَتْلَ لَنَا عَادَةٌ وَكَرَاهَتُنَا الشَّهَادَةَ** ابن زیاد تو مجھے قتل  
 کی دھمکی دے رہا ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہمارے لیے عزت ہے

میرے والد اور میرے بھائیوں کا غم ہی تازہ ہے۔ میں ابھی اسی صدے سے جانبر نہیں ہوا ہوں۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم نہ ہمارا ساتھ دو نہ ہماری مخالفت کرو۔ حسین بن علی کے قتل پر ہی کیا موقوف ہے علیؑ جو ان سے بہتر تھے، اے اہل کوفہ! تم نے انھیں بھی قتل کیا۔ میری جان صدقے میرے پدر گرامی پر تم نے فرات کے کنارے انھیں بھی شہید کر دیا۔ ان کے قاتلوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

کچھ دیر تو نف کے بعد فرمایا:

اگر تم ایک دن ہماری موافقت اور اگلے دن ہماری مخالفت چھوڑ دو تو ہم تم سے بہت خوش ہیں۔

اس کے بعد امام سجادؑ کو گفتگو کا موقع اس وقت ملا جب انھیں ابن زیاد کے سامنے مجلس عام میں لایا گیا۔ آپ نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور مختصر جملے کہہ کر ساری مجلس کو متاثر کر دیا۔

جب آپ کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا: تم کون ہو؟ فرمایا علی بن الحسینؑ۔ اس نے کہا علیؑ کو تو خدا نے مار ڈالا۔ امام نے فرمایا: میرا ایک بھائی تھا۔ اس کا نام بھی علیؑ تھا، لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

مطلب یہ تھا کہ معصیت کو خدا کی طرف منسوب مت کرو اور اوٹ پٹانگ مت بول۔ کہ بلائیں علی بن الحسینؑ (حضرت علی اکبرؑ) کے قاتل لوگ تھے نہ کہ خدا۔

ابن زیاد نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے کہ خدا نے اسے مار ڈالا، امام نے

اور جس کی آپ کے ساتھ صلح ہوگی، اس کے ساتھ ہماری بھی صلح ہوگی ہم مزید کو گرفتار کرنے کی بھی فکر کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ پر ظلم کیا ہے ہم ان سے بیزار ہیں۔

لوگوں کی اس گفتگو سے جو ابن طاووس رضوان اللہ علیہ نے نقل کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اب بھی امام کا مقصد نہیں سمجھے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ آپ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور سپاہ و لشکر کی تیاری کی فکر میں ہیں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ تحریک کا وہ حصہ جس کے لیے مسلح جدوجہد اور شہادت کی ضرورت تھی مکمل ہو چکا ہے۔ اب جنگ، خونریزی اور شمشیر کشی کی ضرورت نہیں۔ اب جو حصہ باقی ہے وہ بھی غیر فانی خطبے میں جن کے ذریعے سارے اسلامی تاریخ میں واقعات عاشورا کی عکاسی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ جو وعدے امام سجادؑ سے کر رہے تھے اور جو اطمینان انھیں دلا رہے تھے وہ اس ہمدردی و ایمان سے زیادہ تو نہیں تھا جو انھوں نے امام حسینؑ سے کیا تھا اس لیے نہ اس کی کوئی وقعت تھی نہ اس پر کوئی بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ وعدے ایسے ہی بے معنی تھے جیسے وہ بیعت جو انھوں نے مسلم بن عقیل سے کی تھی یا وہ خطوط جو انھوں نے امام حسینؑ کو لکھے تھے۔

اس لیے امام سجادؑ نے فرمایا:

اے بے وفامکارو! تمھاری خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہتے ہو جو تم نے میرے پدر بزرگوار کے ساتھ روا رکھا تھا۔ خدا کی قسم! بھی نیک وہ زخم نہیں بھرا۔ ابھی کل ہی میرے پدر بزرگوار اور ان کے ساتھی شہید ہوتے ہیں ابھی تو



خدا تمہیں غارت کرے، تم نے اپنی عاقبت کا یہ سامان کیا ہے! یہ تو تم نے اپنی رو سیما ہی کا انتظام کر لیا۔ کل جب رسول خدا سے سامنا ہو گا تو انہیں کیا متہ دکھاؤ گے؟ اس وقت آنحضرتؐ تم سے کہیں گے کہ تم نے میرے فرزندوں کو قتل کیا ہے اور میرے ساتھ ہجرتی کا سلوک کیا ہے، تم میری امت نہیں ہو!

امام کے ان چند جملوں نے اہل کوفہ کی سوچ بدل دی۔ جو لوگ قیدیوں کا تماشا دیکھتے ہنستے ہوئے آئے تھے ان کے چہروں پر رنج و فکر کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ان کے گلے زندہ گئے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے۔ لوگ ہر چند ضبط کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ادھر ادھر سے چیخوں اور سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا: تو نے بہت بڑا کیا، اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ دوسرے نے کہا: اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں!

لوگ آنسو بہا رہے تھے، آپس بھر رہے تھے کہ امام نے پھر کہا: ان پر خدا کی رحمت ہو جو میری بات سنیں اور خدا اور رسولؐ اور اہلبیتؑ پیغمبر کے بارے میں میری نصیحت قبول کریں۔ رسول خدا کی پیروی ہمارا فرض ہے۔

اس مختصر سے خطاب سے ایسا انقلاب نظر آنے لگا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اے فرزند رسول خدا ہم آپ کی باتیں سنیں گے، آپ کا کہا مانیں گے، آپ سے کیے ہوئے وعدوں پر کار بند رہیں گے اور آپ سے منہ موڑ کر کسی اور کا ساتھ نہیں دیں گے۔ آپ جو فرمائیں ہم اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ جس سے لڑیں گے ہم بھی اس سے لڑیں گے

یہ کون سی فخر کی بات ہے کہ کسی کو لوٹ لیا گیا، اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی، اس کے رشتے دار مارے گئے۔ یہ مصیبت تو ہے، فخر کی بات نہیں چنانچہ اس فقرے نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ تحقیق و تجسس اور مزید غور و فکر سے کام لیں تاکہ تاریخ اسلام میں اس تحریک کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور معلوم کریں کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کی بات میں کتنا وزن ہے اور یہ باقی مسلمانوں کی طرح خاموش کیوں نہیں بیٹھے؟ انھوں نے کیوں دربارِ خلافت کی ہر پیشکش مسترد کر دی؟ اس میں کیا حرج تھا اگر امام حسینؑ ایزد کی بیعت کر لیتے اور مسلمانوں میں عزت سے زندگی گزارتے؟ نہ عزیزوں کو ہاتھ سے کھوتے نہ اپنی جان ہی جھکڑے میں گنوتے۔ امام سجادؑ کے انتہی فقروں نے لوگوں کو کھینچھوڑا اور انھیں بات سننے پر آمادہ کیا۔ شاید بہت سے لوگ کہہ رہے ہوں گے کہ اچھا ہی ہوا کہ لوگ مارے گئے، زندگی معمول پر آگئی۔ عراق کے راستے جو کچھ دنوں سے بند تھے پھر کھل گئے۔ آمد و رفت میں جو دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔ عام لوگوں کی تو یہ سوچ تھی۔ ایسے میں امام سجادؑ نے یہ بانگِ دہل کہا کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے کہ ہمیں قتل کیا گیا اور ہمارا اسباب لوٹ لیا گیا۔ بات کہنے کے اس انداز سے لوگوں کو ایک جھٹکا سا لگا اور ان میں تحقیق و تجسس کی لہر دوڑ گئی۔

امام سجادؑ نے فرمایا:

”لوگو! تمہیں خدا کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میرے پدرِ زہراؑ کو گوارا کو خط لکھے تھے لیکن پھر تم نے ان کو دھوکا دیا۔ تم نے ان سے پختہ وعدے کیے تھے لیکن پھر ان سے جنگ کے لیے کھڑے ہو گئے۔“

امام سجادؑ نے ایک کوئی سے دشمن کی یہودگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا دریا بے فرات کے کنارے سرنظم کر دیا گیا حالانکہ اس نے نہ کسی کا خون بہایا تھا نہ کوئی حق غصب کیا تھا یعنی اسے بے جرم و خطا قتل کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں کہ جب اس میں مقابلے کی طاقت نہ رہی اور وہ گر گیا تو اس کی چھاتی پر پڑھ کر اسے شہید کیا گیا، ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے۔

امام چہارم نے اس فقرے میں لوگوں کو شہادت کے واقعہ پر مزید غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ آپ نے بے کسی کی حالت میں مارے جانے کو قابل فخر بات قرار دیا ہے اور فخر بھی ایسا جس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے فخر کی حاجت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے کہ ہمارا خون بہایا گیا، ہمارا مال لوٹا گیا، ہماری بے حرمتی کی گئی اور ہماری عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ امام چاہتے ہیں کہ لوگ اس پر غور کریں کہ اس جدوجہد کا مقصد کیا تھا، اس تحریک کا سربراہ کیا چاہتا تھا اور اس نے کیا کیا۔ اگر صرف اتنی سی بات تھی کہ وہ خلیفہ بننا چاہتا تھا اور چونکہ خلافت کسی اور کو مل گئی تھی اس لیے بے چین تھا اور اسی آرزو میں جان کی بازی لگادی تھی اور اسی جوش میں جان اور مال سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا تو اس طرح تو کوئی فخر کی بات نہیں بلکہ یہ تو شرم کی بات ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام سجادؑ ایسی بات پر فخر کریں اور یہ کہیں کہ ہمارے لیے یہی فخر کافی ہے!

ان کے اس فقرے پر لوگوں کو ضرور تعجب ہوا ہو گا کہ آخر یہ واقعہ فخر کا موجب کیسے بن گیا؟ کیا لوگ مارے نہیں جاتے؟ سیاسی جنگوں میں کیا کم جانیں تلف ہوتی ہیں؟ ہنگاموں اور مسادات میں کیا جان و مال کا کم نقصان ہوتا ہے؟

داستان بیان کر رہے ہیں اور غم زدہ اپنے باپ، بھائی کی موت پر گریہ و ماتم کر رہے ہیں۔ انھیں قطعاً یہ خیال نہیں تھا کہ اہلبیتؑ اور اصل اس تحریک کے خدائی نقشے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

واقعات کی جو تشریح و توضیح وہ کر رہے تھے اس کے بغیر سید الشہداء کا کاژنڈا مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بات کا قرار واقعی اندیشہ تھا کہ کہیں کل کلاں اس جذبہ جدوجہد کو جس کی سربراہی مقدس و معزز ترین اسلامی ہستیوں نے کی تھی و نبی و مادی اور مادی اغراض کی تحریک ظاہر کر کے اصل حقیقت مسلمانوں اور آئندہ نسلوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ کر دی جائے اور تاریخ میں من گھڑت کہانیاں درج نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ زینب کبریٰؑ ام کلثومؑ اور سید سجادؑ نے اسیری اور رنج و الم کے باوجود عزم و مصہم کے ساتھ لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے سوگواروں کی سی صورت نہیں بنائی اور نہ ہی دشمن کی خوشامد کی، بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے موقع سے اپنے عظیم تر مقصد کے حصول کے لیے فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے ناواقفیت یا کراہی کے باعث انھیں برا بھلا بھی کہا یا دشنام طرازی بھی کی تو انھوں نے اسی ہانے اس سے بات چیت شروع کر دی اور اس طرح اس کے خیالات بدلے کہ آخر اس بدگو نے وہیں توبہ کر لی اور اہلبیتؑ کا حامی بن گیا۔

اہلبیتؑ نے اپنی ذہانت سے وہ کام لیا کہ دشمن کی گالیوں سے بھی انھیں ہی فائدہ پہنچا۔ وہ اس بات کو غنیمت سمجھتے تھے کہ کوئی ان سے بات کرے چاہے گالیوں ہی دے یا مذاق ہی اڑائے کیونکہ اس طرح انھیں اپنی بات کہنے اور لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کا موقع ملتا تھا۔

کرنے کے لیے رضا کا طلب کیے اور شاید یہ بھی احتیاط کی کہ خود ہی کچھ لوگوں کو نامزد کر کے انھیں حکم دے کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ اس شرمناک حرکت میں شرکت سے انکار نہ کر دیں لیکن احتیاط غیر ضروری اور اندیشہ بیجا تھا۔ مؤرخوں کے بقول دس رضا کار فوراً ہی آمادہ ہو گئے جنھوں نے گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو کر مطلوبہ کام بڑے جوش و خروش سے انجام دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ میں ان دس کینوں کا نام نہ آتا۔ مذکورہ موجود ہے۔ بطری اور مفید نے دس میں سے دو کا نام لیا ہے۔ ایک تو اسحاق بن حیوۃ حضرتی جس نے امام کا پیرا بن لوٹا تھا اور دوسرا احنس بن مرثد حضرتی جو امام کا عمامہ اچک کر بھاگا تھا۔ اگر امام شجاع بیماری، سفر کی ٹھکن، اسیری کی پریشانی یا صدمے سے ٹدھال ہونے کے سبب خاموشی اختیار کر لیتے اور روزِ عاشورا کے واقعات کی کوثر کے بازار میں تصویر کشی نہ کرتے یا زینبؑ و ام کلثومؑ اور فاطمہ بنت حسینؑ کوثر کے بازار میں تقریریں نہ کرتیں تو دشمن کو تاریخ کے مسخ کرنے کا موقع مل جاتا۔ پھر بنی امیہ کہاں اجازت دیتے تھے کہ ان کی رسوائی اور بدبختی کی کہانی اسلامی تاریخ کا جزو بن سکے اور بنی ہاشم ہمیشہ کے لیے اپنے حریف کو دینداری انسانیت اور حسن اخلاق کے میدانوں سے نکال باہر کریں۔ جس وقت یہ تقریریں ہو رہی تھیں اس وقت مقرروں کو تو بخوبی معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کا کیا اثر ہوگا، البتہ باقی لوگوں کو قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ تقریریں جو کبھی بازار میں، کبھی دربار میں اور کبھی مسجد میں کی جا رہی ہیں، ان کا تاریخ پر کیا اثر پڑے گا اور مستقبل قریب میں لوگوں کی سوچ کس حد تک بدل جائے گی۔

لوگوں کی اکثریت محض یہ سمجھ رہی تھی کہ مصیبت زدہ بیچارے اپنی مصیبت کی

میں درج ہو گئیں۔

شیخ مفید اور طبری نے لکھا ہے کہ جو لیا س امامؑ کے جسم پر باقی رہ گیا تھا وہ شہادت کے بعد لوٹ لیا گیا۔ امامؑ کا پیرا بن اسحاق بن حیوۃ لے بدن پر سے اتارا۔ امامؑ کا زیر جامہ بحر بن کعب تمیمی لے گیا۔ امامؑ کا عمامہ خنس بن مرثد لے بھاگا۔ امامؑ کی شمشیر قبیلہ بنی دارم کا ایک شخص لے گیا۔ امامؑ کی مخملی چادر قیس بن اشعث بن قیس کنڈی لے اڑا۔ بعد میں وہ کوفہ میں قیس قطیفہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ امامؑ کے جوتے قبیلہ اود کے اسود نامی ایک شخص نے امامؑ کے پاؤں سے اتار لیے۔ اس کے بعد یہ لوگ خیموں پر ٹوٹ پڑے اور جو کپڑے اور برتن، سامان اور اونٹ وہاں تھے سب لوٹ کر لے گئے۔ مکینہ پن کی انتہا یہ کہ خواتین کے سروں پر سے چادریں گھسیٹ لیں۔ یہ تمام تفصیلات تاریخ میں کہاں سے آئیں؟ اہلبیتؑ کے انہی خطبوں اور تقریروں سے جنہوں نے عاشورے کی روداد کو اس قدر تفصیل اور وضاحت سے تاریخ کے صفحات پر منتقل کر دیا۔

تاریخ میں نہ صرف اس کی تصریح ہے کہ ابن زیاد نے ابن سعد کو یہ حکم دیا تھا کہ امامؑ کا لاشہ گھوڑوں کے سموں تلے روندنا جائے بلکہ اس حادثے کی تمام جزئیات بھی بے کم و کاست مذکور ہیں۔ شیخ مفید، طبری اور دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ کچھ لشکر یہی چاہتے تھے کہ امامؑ جہارم کو قتل کر دیں۔ ابن سعد نے خیمے پر پہنچ کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس بیمار سے تعرض نہ کرے اور نہ غم زدہ خواتین کو ستائے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے خیمے لوٹ لیے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ سب سامان واپس کر دیا جائے لیکن پھر بھی کسی نے کوئی چیز واپس نہیں کی۔ اس کے بعد ابن سعد نے ابن زیاد کے حکم کی تعمیل میں امامؑ کے جسدِ اطہر کو مکہ کو لے

لوگو! جو مجھے جانتے ہے وہ تو جانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا اسے میں بتاتا ہوں کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی بے حرمتی کی گئی، جس کا مال و اسباب لوٹا گیا، جس کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔

واقعی اگر امام سجادؑ عرقیوں کی لوٹ مار اور یہودیوں کا تذکرہ نہ کرتے اور اس وقت جبکہ حادثے کو ابھی ایک دو دن ہی ہوئے تھے دربار خلافت میں ابھی شادیاں ہی سبج رہے تھے اور یہ خبر نہیں تھی کہ ظالموں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے اس وقت اگر آپ واقعہ کی تفصیل بیان نہ کرتے اور دشمن کی ناہنجاری کا پردہ فاش نہ کرتے تو کوئی بعید نہیں تھا کہ اسلامی تاریخ میں اس معاملے کو کچھ اور ہی رنگ دیدیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تک لکھ دیا جاتا کہ اہلبیت کو کوفہ اور شام احتراماً لے جایا گیا اور اس کا مقصد ان کی دلجوئی تھا؛ نہ اس میں زور زبردستی کا کوئی دخل تھا اور نہ انہیں قیدی بنانا مقصود تھا لیکن امام چہارم نے اپنے خطبے کے پہلے ہی فقرے میں عاصورا کی صحیح تاریخ بیان کر دی۔ یہاں تک کہ یہی باتیں تیسری صدی ہجری میں اسلامی تاریخ کی مغزین کتابوں میں درج ہو گئیں اور خلفائے بنی امیہ بھی اپنی تمام طاقت و قدرت کے باوجود ان میں ایک حرف کا بھی رد و بدل نہ کر سکے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کم از کم عیوں کو لوٹنے اور امام کے جسم پر سے کپڑے اتارنے کا تذکرہ تو تاریخ کے صفحات پر سے مٹا ہی دیتے اور اس شرمناک کارروائی کی یاد مسلمانوں کے دل سے محو کر دیتے مگر اہلبیت امام نے قید میں ہوتے ہوئے بھی بنی امیہ کے ہاتھ سے یہ طاقت چھین لی اور ایسی کارروائی کی کہ نہ صرف واقعات میں رد و بدل کی راہیں مسدود ہو گئیں بلکہ قاتلانِ امام کے کمینہ پن کی تمام حریمات تاریخ

کی ترغیب اور برائیوں سے تنبیہ ہی کی بات ہے۔ سٹھ بیس مکہ فتح ہوا اور وہاں بنت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے حنین میں قبیلہ ہوازن کے مقابلے میں جس نے مسلمانوں پر حملے کا ارادہ کیا تھا کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد رسول اللہ نے طائف کا قصد کیا تاکہ وہاں سے بھی بت پرستی کا خاتمہ کیا جائے اور لات کا بت خانہ جو طائف کا کعبہ کہلاتا تھا سمہار کر دیا جائے لیکن ایک مدت تک طائف کا محاصرہ کرنے کے باوجود طائف فتح نہ ہو سکا۔ رسول اللہ وہاں سے پہلے مکہ اور پھر مدینہ واپس تشریف لے آئے لیکن ۹ھ میں طائف کے سردار اور وہاں کے قبائل کے نمائندے خود رسول اللہ کے پاس مدینہ آئے اور پیشکش کی کہ ہم مسلمان ہو جاتے ہیں مگر اس شرط پر کہ ایک تو ہمیں نماز سے معاف رکھا جائے اور دوسرے حقوق ہی ہی مدت کے لیے سہی بت کدہ لات کو سمار نہ کیا جائے۔ اگر مقصد صرف طائف کی فتح ہوتا تو چاہیے تھا کہ رسول اللہ بلا تامل یہ تجویز منظور کر لیتے اور غنیمت سمجھتے کہ شہر ہاتھ آ رہا ہے۔ شہر کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیتے اور طائف کے نو مسلموں سے زکوٰۃ اور دوسرے ٹیکس وصول کرتے۔ وہاں کے مردوں کو اسلامی جنگوں میں شرکت کی دعوت دیتے اور اس طرح اسلامی لشکر کی تعداد میں اضافہ کر لیتے لیکن اگرچہ فتوحات اور دوسرے فوائد کے نقطہ نظر سے ان شرائط پر اہل طائف کے اسلام قبول کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ تھا لیکن رسول اللہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے اور جب تک اہل طائف اپنی شرائط پر اصرار کرتے رہے، آپ نے ان کا اسلام قبول نہیں کیا۔ آخری جواب جو آپ نے دیا وہ یہ تھا:

جہاں تک اپنے ہاتھوں سے اپنے بت توڑنے کا سوال ہے تو



ہم تمہیں یہ کام معاف کیے دیتے ہیں۔ اس کام کے لیے دوسرے  
 آدمی بھیج دیے جائیں گے۔ رہی نماز تو جس دین میں نماز نہ ہو اس  
 کا کچھ فائدہ نہیں یعنی شہر طائف کیا، اگر کوئی ملک بھی فتح کیا جائے  
 اور وہاں کے لوگ نماز نہ پڑھیں تو ایسی فتح بیکار ہے“  
 اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر لوگ دیندار ہوں مگر دین شناس  
 نہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔